ماہنامہ

فکرِ نَو

علی گڑھ

جون ۲۰۱۹ء

مدیر

ریاض الرحمٰن شروانی

ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

مدیر

ریاض الرحمٰن شروانی

معاون مدیر

ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں

سال دوم ☆ جون ۲۰۱۹ء ☆ شمارہ نمبر (۱۱)

قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے

قیمت سالانہ: ۱۵۰ روپے

فہرست

ادارے کا مضمون نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

پبلشر مسز غزالہ پروین نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزز علی گڑھ سے چھپوا کر حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ سے شائع کیا

اداریہ

احکام الٰہی کی خلاف ورزی

فکرِ نو کے پچھلے شمارے میں ہم نے نیوزی لینڈ میں نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں کے قتل اور وہاں اس کے ردِّعمل پر اداریہ لکھا تھا۔ اس دوران سری لنکا میں تین سو عیسائیوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی ذمہ داری اسلامک اسٹیٹ، نامی تحریک نے لے لی۔ یہ فعل ہر اعتبار سے قابل مذمت ہے۔ یہ تین سو عیسائی بے گناہ تھے ان کے قتل کا کوئی جواز نہیں ہے اس کی جتنی مذمت مسلمانوں کو نی چاہیے تھی، وہ انہوں نے نہیں کی۔ یہ بات اور زیادہ قابل افسوس ہے غلط کاموں کی مذمت کرنے کے بجائے ان کی تاویل وتوجیہ غیر پسندیدہ اور حکم الٰہی کی خلاف ورزی ہے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ تم (سچی) گواہی دو چاہے وہ تمہارے اعزاء، والدین اور خود اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم ان کفار سے لڑو جو تم سے لڑیں، یا تمہیں اپنے گھروں سے نکالیں یا ایسا کرنے والوں کی مدد کریں۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سری لنکا کے عیسائیوں نے آسٹریلیا کے اس عیسائی کی مدد کی تھی جو نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کا قاتل تھا۔ اور پھر نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم اور باشندوں نے اس واقعہ کی جس طرح مذمت کی اور وہاں کے مسلمانوں کا ساتھ دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جنونی آسٹریلین عیسائی کے فعل سے عام عیسائیوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ناحق قتل اسلامی روایات کے قطعاً خلاف ہے۔ اس کی شدید مذمت ہونی چاہیے اور ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کسی دوسری جگہ اس کے ہم مذہبوں سے اس کا بدلہ لیں۔

اسلام میں جہاد کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کا حکم بھی ہے لیکن اس کے شرائط بہت سخت ہیں جب کہ اوپر لکھا گیا صرف ان لوگوں سے لڑنے کا حکم ہے جو مسلمانوں سے لڑیں یا ان کو اپنے گھروں سے نکالیں۔ جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں، ضعیف ہیں بچے ہیں، عورتیں ہیں، قتل کرنا ممنوع ہے یہاں تک کہ سبز درختوں کے کاٹنے کی اجازت بھی نہیں ہے، یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ تم نیکی اور خوف خدا میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو لیکن گناہ اور ظلم وزیادتی میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو۔ جب ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں ہندوستان پاکستان کے درمیان پہلی جنگ ہوئی تو عام طور پر پاکستان کے علماء نے اسے جہاد قرار دیا، لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسے جہاد ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کی رائے تھی کہ جہاد کی جو شرائط ہیں وہ اس موقع پر پوری نہیں ہوتیں۔ جن جماعتوں نے اپنے نام اسلام یا اسلامی بزرگوں کے نام پر رکھ لئے ہیں اور پھر شیطانی حرکتیں کرتے ہیں وہ اسلام کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ دشمنانِ اسلام ان کے مافات اعمال کو اسلام سے جوڑتے ہیں اور اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ عام مسلمان بلاحیل وحجت ان سے اپنی برأت کا اظہار کریں، اور کھل کر ان کی مذمت کریں۔ افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوتا جب دوسرے اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں تو ہمیں کتنی تکلیف پہونچتی ہے اسی پر ہمیں دوسروں کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ فارسی میں کہا گیا ہے کہ جو اپنے لئے پسند نہ کرو وہی دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

ہندوستان میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں کو صحیح نہیں مانتی بلکہ دوسرے درجے کا شہری گردانتی ہے، جب مسلمان اور عیسائی خود دست وگریباں بن جائیں گے تو اس جماعت کو کتنی تقویت پہنچے گی۔ اس لیے ہمیں اس طرح کے اعمال جیسا سری لنکا میں اسلامی اسٹیٹ نامی تنظیم نے کیا، کے خلاف شدید احتجاج کرنا چاہیے اور کسی طرح ان سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کی حرکتوں سے دوسروں کو بھی ظلم و زیادتی کا موقع ملتا ہے اور وہ سب مسلمانوں کو ایک صف میں کھڑا کر کے انہیں ظالم وجابر قرار دیتے ہیں ہمیں انہیں اس کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے۔

سُنا ہے کہ سری لنکا کی حکومت نے سر اور منہ پر کپڑا ڈالنے کی ممانعت کر دی ہے کیوں کہ جن لوگوں نے عیسائیوں پر حملہ کیا وہ اپنے سر اور منھ ڈھانپے ہوئے تھے۔ سری لنکا کی حکومت کے اس حکم کی تائید نہیں کی جاسکتی، لیکن اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اس فعلِ بد کے مرتکب ہوئے ہیں۔

حق وانصاف سے انحراف

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے یہ توقع نہیں کی جاتی ہے کہ اس کے رسائل میں اپنے قدیم مرحوم اساتذہ اور دوسرے اداروں کی ممتاز شخصیتوں کی توہین اور تحقیر کی جائے گی لیکن افسوس ہے کہ تہذیب الاخلاق کے اپریل ۲۰۱۹ء کے شمارے میں پانچ گراں مایہ شخصیتوں کی بلاوجہ توہین وتخفیف کی گئی ہے۔ مضمون خود مدیر محترم کا لکھا ہوا ہے اور علی گڑھ کے ایک سابق طالب علم اقبال سہیل صاحب پر لکھا گیا ہے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ہم عصر تھے۔ رشید صاحب نے ایک رسالہ نکالا تھا اس کا نام 'سہیل' رکھا تھا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ عبدالعزیز میمن، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مختار الدین احمد کو گھسیٹا جاتا اور بلاوجہ ان کی تخفیف کی جاتی۔ اقبال سہیل صاحب میں اور ان پانچوں اشخاص میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے سوائے اس کے کہ اقبال سہیل صاحب مولانا آزاد کی طرح حریت پسند تھے۔ اور آل احمد سرور کی طرح شاعر تھے، لیکن دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو یہ نہ مانتا ہو کہ جو حریت پسند گزرے ہیں ان میں مولانا آزاد کے مرتبے کو کم لوگ پہنچے ہوں گے۔ شاعری کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ سرور صاحب اور اقبال سہیل صاحب میں کون فوقیت رکھتا ہے۔ چونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی صف اول کا شاعر نہیں ہے۔

ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی تشریف فرما ہیں اور ان کے ارد گرد ان کے شاگرد بھی بیٹھے ہوئے ہیں مولانا آزاد بھی وہاں موجود ہیں وہ علامہ شبلی کے شاگرد نہیں ہیں لیکن ان کی اتنی توقیر کرتے ہیں کہ خطوط میں انہیں آقائے من کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ علامہ شبلی اپنے شاگردوں سے کسی موضوع پر کچھ لکھواتے ہیں مگر ان سے مطمئن نہیں ہوتے مولانا آزاد اٹھ کر ان کے پاس آتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ علامہ شبلی چند الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں مولانا آزاد چند منٹوں میں مضمون لکھتے ہیں اور علامہ کے پاس لیکر آتے ہیں اور علامہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا ذکر ہے۔ ربوبیت، رحمت اور انصاف۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں ان صفات، بالخصوص رب العالمین کی جو تشریح کی ہے اس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں ان کا ایک فقرہ ہے ''دنیا میں گناہ کی سزا دیجاتی ہے، یوسفؑ کو بے گناہی کی سزا دی گئی۔ اس ایک جملے نے اس واقعے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سورۂ یوسف میں اسلامی اقتصادی نظام کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ لاجواب ہے۔ ذوالقرنین کی شخصیت کی جو تعیین مولانا آزاد نے کی ہے وہ دوسروں کے لئے نمونہ اور مثال بن گئی ہے۔ دو ایسے اشخاص جو سیاست میں مولانا کے شدید مخالف تھے انہوں نے غبار خاطر کی انشاء پردازی کی جو تعریف و توصیف کی ہے وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ ہندوستان میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور پاکستان میں مختار مسعود۔ سیاست میں مولانا کا جو درجہ تھا اس کے بارے میں سابق وائس رائے لارڈ ویویل نے اپنی یادداشتوں (Memoirs) میں لکھا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں مولانا آزاد سے زیادہ عاقل کوئی اور شخص نہیں تھا، پاکستان سے ایک کتاب چھپی تھی جس کا نام تھا مولانا آزاد کی پیشین گوئیاں اور پھر بتایا تھا کہ ان کی کون کون سی پیشین گوئی کس کس طرح صحیح ثابت ہوئی۔

جس مضمون کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں ایک جملہ ہے کہ علم اور انشاء پردازی دو متضاد چیزیں ہیں اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو آپ علامہ شبلی کو کہاں رکھیں گے وہ عالم بھی تھے اور انشاء پرداز بھی۔ شاید فاضل مضمون نگار کو یہ نہ معلوم ہو کہ اردو نثر کے دو اسکول ہیں ایک حالی اسکول اور دوسرا شبلی اسکول۔ حالی اسکول کی خصوصیت سادگی اور صفائی ہے اور شبلی اسکول کی رنگینی و رعنائی۔

پروفیسر آل احمد سرور شاعر بھی تھے اور تنقید نگار بھی۔ اقبال سہیل صاحب کو تنقید نگار کوئی بھی نہیں کہے گا۔ سرور صاحب کی نگاہ علی گڑھ تحریک پر بہت گہری اور وسیع تھی انہوں نے عربی شاعری سے تراجم کے ذریعے واقفیت حاصل کی تھی۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن کو عرب وعجم کے علماء عبقری کہتے ہیں ایک رسالے کے ایڈیٹر صاحب اگر انہیں عبقری نہیں مانتے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں متحدہ ہندوستان

میں صرف دو اشخاص کو عربی ادب کا ماہر ہونا سنا تھا۔ پروفیسر میمن اور مولانا محمد سورتی۔ مولانا سورتی کا انتقال پہلے ہو گیا وہ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہیں پروفیسر مختار الدین احمد کی روایت ہے کہ وہ پروفیسر میمن کے ساتھ یونیورسٹی کے قبرستان سے گزر رہے تھے جب مولانا سورتی کی قبر کے پاس پہنچے تو میمن صاحب نے اپنی چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے اس قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہاں علم کا پہاڑ سو رہا ہے۔ یہ تھی اس زمانے کے علماء کی کشادہ دلی اور وسعت نظر۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کسی رسالے میں ندوۃ العلماء کے علماء کی تحقیر جتنا غیر پسندیدہ عمل ہے اسے بیان کرنا محال ہے۔ مولانا علی میاں ایسا نام ہے جس کی فضیلت کے ذکر سے عرب و عجم گونج رہے ہیں۔ دو چار لاعلموں کے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اردو کے ادیب نہیں تھے لیکن عربی میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اور جس انداز میں لکھا ہے اس کی مثال ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ میں تلاش کرنا فعلِ عبث ہے۔ ان کی کس کس کتاب کا ذکر کیا جائے۔ ایک کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین پڑھ لیجیے۔ دل و دماغ روشن ہو جائیں گے۔

پروفیسر مختار الدین احمد کو عبقری کوئی نہیں کہتا لیکن ان کے محقق ہونے میں شبہ نہیں ہے انہوں نے عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں حق تحقیق ادا کیا ہے۔ انہوں نے عربی متن کی تہذیب و ترتیب کر کے جتنے طالب علموں کو پی ایچ۔ ڈی کرایا وہ کسی اور نے نہیں کرایا۔ جب وہ شعبۂ اسلامیات میں تھے تو اردو میں اور جب شعبۂ عربی میں واپس آ گئے تو عربی میں جس معیار کے رسائل شائع کیے وہ کسی اور نے نہیں کیے۔

پروفیسر عبدالعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے لیکن ان کی علمیت و عبقریت صرف عربی تک محدود نہیں تھی وہ اردو میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شامل تھے۔ وہ سال میں ایک مضمون لکھتے تھے جو اگلے سال کے لیے ترقی پسند تحریک کا منشور بن جاتا تھا۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کو کیا سے کیا بنا دیا۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز انہیں کے دور میں قائم ہوا وہ جب ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ آئے تو انہیں شعبۂ عربی میں صرف ایک استاد مولانا بدرالدین علوی اور ریسرچ اسکالرز میں صرف مختار الدین احمد ملے اور جب وہ ۱۹۶۸ء میں شعبۂ عربی چھوڑ کر گئے تو بائیس اسکالرز عربی اور اسلامک اسٹڈیز میں کام کر رہے تھے۔

سنا ہے کہ تہذیب الاخلاق کا یہ شمارہ زبان کی غلطیوں سے پُر ہے۔ تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر صاحب کو چاہیے کہ وہ قارئین سے غیر مشروط معافی مانگیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری یہ تحریر وائس چانسلر صاحب کی نظر سے ضرور گذرے۔

ریاض الرحمٰن شروانی

نئے ہندوستان کے ''اکلاویا''

(۳)

ہرش مندر
مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں

(نوٹ:۔ ہرش مندر ایک آئی اے ایس افسر تھے۔ انہوں نے ۲۰۰۲ء میں گجرات فسادات کے بعد سول سروس سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور جب ہی سے انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے ایک سر گرم کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اُن کی چار سو صفحات پر مبنی حالیہ کتاب بعنوان Looking away کے چند صفحات کا ترجمہ اس مضمون کے بطورِ پیش خدمت ہے)۔

کچھ عرصہ پہلے، دیہات میں چھوت چھات کے موضوع پر ایک سروے کیا گیا تھا' جو تقریباً دس مختلف صوبہ جات پر مبنی تھا جس کے دوران میں نے بھی دوسرے چار سماجی سائنس کے ماہرین کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس سروے کے دوران ہم نے دیکھا تھا کہ ہر تین میں سے ایک بلکہ اکثر دو میں سے ہر ایک دیہات کے اسکول میں (آج بھی) دلت بچوں کو کلاس میں علیحدہ، سب سے پیچھے بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اُن کو دوسرے بچوں سے علیحدہ بیٹھا کر علیحدہ برتنوں میں کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اکثر اساتذہ ان بچوں سے فرش اور ٹوائیلٹ کی صفائی بھی کرواتے ہیں۔ اس طرح کا کام کبھی کسی اونچی ذات کے بچے سے نہیں لیا جاتا ہے۔ ''جنگلی سور'' نامی مراٹھی فلم میں جبیا کو آخیر میں جس طرح کا ایک حتمی قسم کا ذلت کا احساس ہوا تھا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن بچوں کے دل و دماغ پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہوں گے۔ جو ان اسکولوں میں اُن بچوں کے ساتھ پڑھتے ہیں جو صرف اپنی ذات کی وجہ سے سماجی طور پر اُن سے اعلیٰ اور برتر ہیں۔

اس سروے کی رپورٹ میں نہایت منفی نتائج پر پہونچنے کے باوجود لکھا گیا تھا کہ ملک میں ان بچوں کی تمام تر مشکلات کے باوجود ان بچوں کا پیدل یا سائیکل پر روز پڑھنے کی امنگ لیے اسکول تک جانے کے ذوق وشوق کو بڑھاوا دینے کی خاطر اصلاحات نافذ کرنے کی فوری ضرورت ہے۔

مراٹھی دلت شاعر ''وامن کاردک'' لکھتا ہے۔

یا خدا
میرے بچے کو اسکول بھیج
میری بس یہ ہی استدعا ہے
میرے بچے کو اسکول بھیج
چاہے ہم مکمل طور پر غریب و نادار ہوں
چاہے قحط ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہو
لیکن پھر بھی میں چاہوں گا میرا بچہ اسکول جائے
یا خدا۔ میرے بچے کو اسکول بھیج
میں ننگا ہو جاؤں، پرواہ نہیں
بس میرے بچے کا تن ڈھکا رہے
ہیرے جواہر میرے لیے بیکار ہیں
بس میرے بچے کو اسکول بھیج
یا خدا۔ میرے بچے کو اسکول بھیج

۲۰۱۳ء میں بہار کے دیہات چھپرا میں ۲۳ بچوں کو ایک گورنمنٹ اسکول میں، اسکول میں ملنے والے کھانے سے موت ہو گئی تھی۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے وقتی طور پر عام لوگوں کے ذہن اور ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس طرح کا واقعہ کہیں بھی ہو سکتا تھا اور شاید ہوتا رہتا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے واقعات جو عموماً ہوتے رہتے تھے وہ ہماری نظروں سے بچے رہتے تھے اس لیے با آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بڑا اور نہایت المناک سانحہ عرصہ سے رونما ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ المیہ صرف چند نچلے درجہ کے کرمچاریوں کی غفلت کی وجہ سے نہیں واقع ہوا تھا، جیسا کہ عام طور پر کہا جا رہا ہے۔ بلکہ اس کے پس پشت بڑی وجوہات موجود ہیں۔ دراصل یہ المیہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ غریبوں کے لیے رفاہ عامہ کے پروگرام، خاص طور پر غریب بچوں کے سلسلے کے پروگرام، کس بے اعتنائی اور لاپروائی سے منظم کیے جاتے ہیں اور ان کی دیکھ ریکھ میں بھی کتنی لاپروائی برتی جاتی ہے۔ وہ پرائمری اسکول جس میں یہ المیہ واقع ہوا تھا اُس کی اپنی کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ وہ ایک مقامی گورنمنٹ آفس کی بلڈنگ میں واقع تھا۔ اُس عمارت میں کوئی ''اسٹور'' موجود نہیں تھا اسی وجہ سے بچوں کے کھانے کا راشن ایک ساتھ خرید کر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اسکول میں صرف دو ٹیچرز تھے جو اسکول کی پانچ مختلف کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔ اُن میں سے

ایک چھٹی پر تھا اور اُس روز (یعنی جس روز یہ حادثہ ہوا تھا) صرف ایک ہی ٹیچر اسکول میں موجود تھی۔ وہ بیچاری بھی نہایت معمولی تنخواہ پر جز وقتی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ وہ بچوں کے کھانے کا روز کا راشن ایک مقامی دوکان سے خریدتی تھی۔ ایک کنستر جس میں کھانا پکانے کا تیل لایا گیا تھا وہ شاید پہلے کبھی کیڑے مارنے کی دوا رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

دراصل اُس ٹیچر کو بچوں کی المناک موت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ وہ تو اُس سسٹم میں اپنے طور پر بہترین کارکردگی کر رہی تھی جس سسٹم کی نظروں میں ''اُن نادار بچوں کی زندگیوں کی جن کو وہ پڑھا اور کھلا رہی تھی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

پورے ملک میں اسکولوں میں بچوں کے کھانے کے انتظامات کے سلسلے میں وسائل کی بے حد کمی ہے۔ کھانے کی اشیا میں بے تحاشہ اضافہ کے باوجود اسکولوں کو ملنے والی کھانے کی گرانٹ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ بہت سے اسکولوں میں راشن رکھنے، کھانا پکانے یا کھانا کھلانے کے لیے برتنوں کے سلسلے میں کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ان اسکولوں میں پینے کے پانی تک کا فقدان ہے۔ کھانا پکانے والے کرمچاریوں کو نہایت ہی معمولی تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ اس طرح کے وسیع پیمانے پر منظم کیے جانے والے پروگرام کی نگرانی کے لیے بھی ضروری ہے، اوپر سے ایک مرکزی اقتدار کے بجائے ہر جگہ مقامی طور اس پر نظر رکھی جائے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ مقامی سماجی چوکسی بڑھائی جائے جو اس پر اپنی نظر رکھے ہمیں بچوں کی شکایتوں کو سنتے رہنے کی ضرورت ہے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ بچوں کے والدین کی کمیٹیاں بنائی جائیں جن کو اختیار دیا جائے کہ وہ برابر اس پورے نظام کی جانچ پڑتال کرتی رہیں۔

اس طرح ہمیں عام لوگوں کے بھروسہ کے ساتھ اُن سے کچھ زائد پیسہ بھی مل سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ سیاسی سرپرستی اور معاونت میں اضافہ کے ساتھ ہی انتظامیہ کی جواب دہی کی ذمہ داری بھی بڑھ جائیگی۔ ہمیں معاشی گرانٹ اور دوسرے ذرائع میں توسیع کے ساتھ ہی ضروری اصلاحات کے لیے آواز اٹھاتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ عوام کے پیسے کو خرچ کرنے کے لیے ہمارے بچوں کی صحت اور تعلیم سے زیادہ ضروری کوئی دوسری ''مد'' نہیں ہوسکتی ہے۔ جی ہاں ہمارے ''سب'' بچوں کی صحت اور تعلیم سے زیادہ ضروری کوئی دوسری ''مد'' نہیں ہوسکتی ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ گورنمنٹ اسکولوں (یعنی پبلک اسکولوں) کے بجائے، پرائیوٹ اسکولوں کے ذریعہ تعلیم میں نمایاں ترقی واقع ہوسکتی ہے۔ آج غریب آدمی بھی پرائیوٹ اسکولوں کی تعلیم کو ترجیح دینے لگا ہے کیونکہ پبلک سیکٹر کے اسکولوں (یعنی گورنمنٹ کے اسکولوں) میں کوئی کام ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحیح معنی میں ایک سب کے لیے یکساں یعنی ''مساواتی'' نظام تعلیم صرف مشترک اور یکساں اسکول سسٹم کے ذریعہ ہی

منظم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں امیر وغریب یعنی کل بچے (بغیر کسی امتیاز کے) ایک ساتھ ایک ہی طرح کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ پرائیوٹ اسکولوں کی تعلیم کا سسٹم سماج میں عدم مساوات کو بڑھاتا ہے۔ ساری دنیا میں لوگ اب اس طرح سوچنے لگے ہیں۔ آکسفورڈ کے میکس لاوسن (Max Lauoan) نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ سابق میں ورلڈ بینک، سب کے لیے مفت پرائمری ایجوکیشن کے سلسلے میں بہت کوشاں رہا تھا لیکن اب پبلک ایجوکیشن کے بجائے پرائیوٹ ایجوکیشن سسٹم کو بڑھاوا دینے سے زیادہ مصروف نظر آنے لگا ہے۔ اور اس سلسلے میں اُس نے پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر پرائیوٹ ایجوکیشن کو بڑھاوا دینے میں مدد کرنا شروع کردی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یونیسکو کی پرائمری تعلیم کے سلسلے کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں تقریباً ۲۰ فیصد غریب خاندان ایسے ہیں کہ اگر وہ اپنے سب بچوں کو پرائیوٹ اسکولوں میں داخل کردیں تو اُن کی کل آمدنی کا ۱۲۷ فیصد حصہ ان کی پڑھائی پر خرچ ہوگا۔ (مطلب یہ کہ اُن کو اپنی کل آمدنی سے کہیں زیادہ صرف اپنے بچوں کی ''ابتدائی'' تعلیم پر خرچ کرنا ہوگا)

کم اور بیش یہ ہی صورت حال ہمارے ملک میں بھی ہے اس لیے ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

☆

بنیادی دائرہ کا تعین*

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

ہم میں سے کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے اسلام کو اسی طرح سمجھ لیا ہے جس طرح رسول کریمؐ نے سمجھا، یا سمجھایا تھا۔ ہم میں سے ہر شخص نے اسلام کو اپنے طریقہ سے سمجھا ہے یا جیسا کہ کسی نے براہ راست، ہمیں سمجھایا ہے: مولانا تھانوی نے، مولانا مودودی نے، مولانا آزاد نے، اقبال نے، سرسید نے وغیرہ۔

ان سے پہلے، جب تک کہ ہمارے ذہن ان لوگوں کے ذریعہ سمجھنے کے لائق نہیں ہوئے تھے، ہم نے ماں کی گود سے لے کر خاندان، محلّہ، شہر اور ملک کے ہر فعال عنصر سے اثر پذیر ہوکر اسلام کو ایک خاص انداز پر سمجھنا شروع کردیا تھا۔ اتنی ان گنت چھاپوں کے بعد اگر کوئی ادعائی انداز اختیار کرتا ہے، اس طور پر کہ اسلام کو جس طرح اس نے سمجھا ہے وہی صحیح ہے، ایسا موقف اختیار کرنا حق وانصاف کے قرین نہ ہوگا۔

اسی لیے اس کا امکان کم ہے کہ اسلام کی مکمل تفہیم کسی ایک مفکر کے ذریعہ ہوجائے۔ ریزہ ریزہ، منتشر سچائی کو، یہاں سے، وہاں سے، جمع کرنا ہوگا۔ اور یہ اس نیت سے نہیں کہ اسلام کے اپنے ایک خاص ورژن کے لئے دلائل جمع کئے جائیں؛ بلکہ خالص طالب علمانہ انداز میں، محض حق کی تلاش میں۔ اس کے لیے کسی بھی متلاشیِ حق کو بدنیت سمجھے بغیر، اس کی تلاش کے نتائج کو ہمدردی اور دلسوزی سے دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔

ذہن میں کچھ سوال اٹھتے ہیں۔ بعضوں کے جواب مل جاتے ہیں بعض کے نہیں ملتے، اونچی آواز سے سوچ رہا ہوں سوچ میں آپ کو بھی شریک کرتا ہوں:

اسلام کا منشا، اور اسلام اور مسلمان کی بہتری، کیا اس میں ہے کہ اسلام کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا جاتا رہے جس کے نتیجہ میں بنیادوں میں نامحکمی اور نااستواری بڑھتی چلی جائے، اور پھر جہاں جہاں کسی کمزور پہلو پر دباؤ پڑے یا ہم کوئی موقف نہ لے سکیں؛ یا جھکنا جہاں جہاں ضرور ہو، تاکہ ٹوٹ نہ جائیں، وہاں وہاں ہم اسلام میں ترمیم، اضافہ، نظرثانی کراتے چلے جائیں، قبولتے چلے جائیں۔ اور اس طرح صرف اسلام ہی کو کھلونا نہ بنالیں بلکہ مسلمان کو بھی ایک base-less, demoralised community میں ڈھالتے چلے جائیں؛ یا اس میں ہے کہ: محکم اور استوار اور غیر متزلزل اور غیر متبدل ''لازمی''

(Essential) اسلام کے حدود پوری طرح غور وخوض کے بعد اس طرح متعین کیے جائیں کہ پھر ان حدود کے اندر کسی قیمت پر، کسی بھی گوشہ سے، کسی بھی قسم کی مداخلت کا گزر بھی نہ ہونے دیا جائے، اجتہاد کے نام سے کسی بھی کھینچا تانی اور تاویل وتوجیہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے کہ یہ کہنے کا موقع ملے:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہاں حرم بے توفیق

نہ کسی ابوالکلام کو لکم دینکم ولی دین کی من مانی تفسیر کرنے کی ضرورت پیش آئے، نہ وحدت دین اور وحدت ادیان کا قصہ چھڑے، نہ کوئی سیما کی تلاش میں مارا مارا پھرے۔

دائرہ کی توسیع /تجدید کے لیے ایک مثال سائنس اور اسلام کی ہے: سائنس کی ہر آن بدلتی تھیوریوں کو آپ قرآن سے مطابق کرتے کرتے تھک جائیں گے، اور اس درمیان میں کوئی نئی تھیوری آپ کی اس وقت تک کی کوشش کو رائیگاں کر چکی ہوگی۔ کیا قدم قدم قرآن سے سائنس کی یا سائنس سے قرآن کی تائید یا تردید کراتے جانا اسلام کے حق میں مفید ہوگا یا مضر؟

دائرہ کی توسیع، یا دوسرے زاویہ سے تجدید، کی ایک مثال عصری عالمی تہذیب کی آوردہ بعض سامنے کی چیزیں ہیں: انشورنس، بنک کاری، پردہ، پارلیمنٹ، یا نظام عائلی قسم کی چیزیں، جنھیں بعضے قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کے درپے رہتے ہیں اور بعضے اسی طور سے رد کرنے کی فکر میں؛ یا مثلاً تصویر سازی اور موسیقی کے سلسلہ میں یا لباس کے معاملے میں۔ حتی کہ چاند میں اترنے کے بارے میں بھی ہر دو فریق اسلام کو استعمال کریں؛ یہ اسلام کے اصل منشا کے مطابق ہوگا یا نا مطابق؟

خالق کائنات نے جب انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنایا اور عقل کل میں سے ایک قابل لحاظ حصہ یہ دنیا چلانے کے لیے اپنے خلیفہ کو ودیعت فرمایا تو یہ سب کچھ یونہی اور 'عبث' تھا؛ یا خالق کائنات کا منشا اس اشرف الخلوقات کو اسکی (گویا اپنی) عقل کی روشنی میں تجربہ کا موقع فراہم کرنا تھا؟

رسول کریم نے جب بالاعلان امور دنیا کے سلسلے میں ایک موقع پر معمولی بدوؤں کو اپنے سے زیادہ علم والا (اعلم) بتایا تھا تو منصب رسالت کو (خاکم بدہن) نیچا کیا تھا یا اس طرح منشائے رسالت کو بدوؤں کے سامنے متعین طور پر پیش کر دیا تھا؟

اسلام نظام حیات ہے یا نظریہ حیات، جو نظام حیات کی قدم قدم پر تخلیق کرتا چلتا ہے، اس طور پر کہ

وہ امور دنیا کو دیکھنے، سرانجام دینے کا ایک ویو (View) دیتا ہے جس طرح شرافت جسے آپ چاہیں تو نظام حیات بھی کہہ لیں! لیکن وہ تو ایک نظریہ حیات ہے!!

اسلام کی رو سے یہ کرسی یا وہ ٹیبل لیمپ اچھا ہے یا برا، سوال کا یہ انداز اسلامی ہو گا یا یہ کہ یہ کرسی اس خاص سماج کے لیے مفید یا مضر؟

اسوہ حسنہ سے کیا مراد ہے۔

رسول کریمؐ نے زندگی کو جس طور سے برتا، کیا اس میں رسول عربی اور رحمۃ للعالمین ساتھ ساتھ اور صاف صاف نظر نہیں آتے؟ اور کیا وہ صاحب نظر جس نے امور دنیا کے معاملہ میں کسانوں کو اعلم قرار دینے کی حقیقت پسندی دکھائی تھی، عربیت کو عالمیت کا غلاف قرار دیتا؟ یا ایک عالمی نظریہ حیات کے مدارج کے ارتقا کا ایک passing phase مرحلہ گزراں!

ایک اور معاملہ بھی توجہ چاہتا ہے: غار حرا میں مہیب تنہائی کے کڑے دن اور طویل راتیں گزار گزار کے، حقیقت کے متلاشی کو ایک religious experience ہوا، اس کے دل کا کرب کوئی نہیں پا سکے گا اور نہ اس واردات کی گہرائی اور گیرائی کو، جو نا قابل ترسیل ہوتی ہے، اور قطعی شخصی اور ذاتی۔ لیکن اس واردات کے قلب اطہر پر نزول کے ٹھوس نتائج ہمارے حقیر ذہن بھی احاطہ کر لیتے ہیں جو عبارت ہیں اعلیٰ اقدار پر مشتمل ایک ایسی پاک زندگی سے جو تاریخ کی عظیم ترین شخصیت بن کے ہمارے سامنے آئی اور نمونہ کی زندگی گزارنے کا اعلیٰ ترین سلیقہ سکھاتی چلی گئی، ایسی زندگی جسے ہر سماج اپنے لیے رحمت قرار دے نہ کہ زحمت۔

ایسی عظیم شخصیت پارس ہوتی ہے، پتھر بھی جس سے مس ہو کے سونا بن جاتا ہے، اعلیٰ اقدار کے نفیس ترین پاسبان نے پھر جس چیز پر ہاتھ رکھا اس کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا۔ ایک ریاست قائم کی جو دنیا کے نمونہ کی ریاست ٹھہری، اتنی تعداد میں ریاست کو چلانے والے ایسے کارکن بنا دیئے جو دنیا کے حکمرانوں کے لیے ایسا نمونہ بن گئے جن کی تقلید انسان کے بس کی بات نہیں لگتی۔

مذہبی واردات کا لازمی نتیجہ اقدار کی چاکری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اقدار کی چاکری لازماً ایک ریاست کے قیام کی طالب نہیں ہوتی۔ ریاست خود اس کی طالب ہوتی ہے کہ اقدار کا چاکر اسے بھی چھو کے سونا بنا دے۔ رسول کریمؐ نے اقدار کی چاکری کرنے والوں کا ایک صالح معاشرہ برپا کیا تھا، ریاست تو خود ہی وجود میں آ گئی جو نہ ان کا منشا تھا نہ ہدف!

دولت، شہرت، اقتدار، یہ انسان کی تین بنیادی کمزوریاں ہیں جن کے حصول کے وہ درپے رہتا

ہے۔خواہش دلائل بھی مہیا کردیتی ہے۔ ریاست کا قیام اسلام کا بنیادی منشا قرار دے دیا جاتا ہے کیوں کہ اس کے لیے نہ کسی طویل کربناک عمل سے گزرنا پڑے گا واردات مذہبی جس سے عبارت ہے؛ اور نہ اعلیٰ ادنیٰ کی خوشامد کرنی پڑے گی۔ طاقت کے حصول کا نشہ ایک طرف، اور ساری زندگی کچھ abstract تصورات کی خاطر بندگان خدا کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کردینا (اس طور پر کہ نیٹشے کے بقول وہ سرتاپا اپنی خصوصیات کا حاصل ہوجائے) دوسری طرف۔اس دنیا میں زندگی گزارنے والا عام آدمی جو سیاسی جانور بنتا جارہا ہے، بے اختیار اس طرف کھنچنے لگتا ہے اور اس سب چکر میں پڑ کے دل کی دنیا، اور انتم اعلم باموردنیا کم، اور وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین، سب کچھ کھوتا جاتا ہے۔

امور دنیا اس کے احاطہ میں نہیں آتے۔ مقامی رسوم، رواج، اطوار، رہن سہن نہیں آتے۔ وہ سارے امور نہیں آتے جو سائنس کے دائرہ اثر میں نہیں آتے ہیں۔ پھر، بچا کیا، پھر اور آگے بڑھ کے اسلامی ریاست کے قیام کو بھی اسلام میں نہیں لیا گیا تو اسلام رہ کیا گیا؟

کیا صرف نماز، روزہ، زکوۃ اور حج!

نماز روزہ کے بارے میں قرآن مجید نے جس طور سے ہدایات دی ہیں ایسی ہی ہدایات کچھ دوسرے امور کے بارے میں بھی ہیں۔ سچ بولنا، پورا تولنا، پاس اور عہد کو پورا کرنا وازیں قبیل۔ ہم نے احکام کے ایک حصہ پر جو فارم سے زیادہ متعلق تھا پورا زور دے دیا اتنا کہ۔

روز محشر کہ جانگداز بود　　　　اولیں پرسش نماز بود

اور دوسرا حصہ جو کردار سازی سے متعلق تھا اڑا ہی دیا۔ ارکان اسلام میں اس قسم کے امور کو شاذ ونادر ہی شامل کیا جاتا ہے۔ اپنے کو ساری عمر تپاتے رہ کر کردار اور شخصیت کی تشکیل، نہ سہل ہے نہ خوشگوار! نماز روزہ وغیرہ تو متعدد ذرائع میں سے چند ذرائع تھے جن پر عمل پیرا ہو کر اعلیٰ اقدار کا مجسمہ اس طرح ابھرتا کہ ہر ایک پکار اٹھتا: یہ مسلمان جارہا ہے! نماز روزہ کے باوجود ہم اعلیٰ ترین کردار کے بجائے اسفل ترین اخلاق کا نمونہ بنتے جارہے ہیں۔کیا اس کی یہی وجہ تو نہیں کہ ارکان اسلام کی صحیح ہیئت کے سلسلے میں احساس تناسب کھو بیٹھے ہیں۔ارأیت الذی یکذب بالدین فذالك الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین، فویل للمصلین الخ۔ تو دائرے کا تعین کیسے ہو؟

☆

مجالس حسنیؒ

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کئی بار کالی کٹ تشریف لائے۔ ان ملاقاتوں کی روداد میں نے لکھ لیا تھا ایک بار حضرت ایک سمینار میں تشریف لائے اور چار دن قیام فرمایا۔ اس سمینار میں شرکت رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے فرمائی۔ اس کی وجہ حضرت والا نے یہ بتائی کہ حضرت رابطہ عالم اسلامی کے جلسہ میں نہ جاسکے۔ پھر جب رابطہ کا یہ خط آیا تو کیرالہ میں سمینار میں شرکت کا جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے ہوا، ممپاڈ کالج میں۔ اس کالج کو مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے قائم کیا جس کے بانی ڈاکٹر عبدالغفور تھے۔ انھوںنے کیرالہ میں سات کالج قائم کیے تھے ایک انجیرنگ کالج بھی قائم کیا تھا اور اب ایک میڈیکل کالج بھی قائم ہوگیا ہے۔ کیرالہ میں حضرت مولانا کے چہارروزہ قیام کے دوران ڈاکٹر عبدالغفور نے مولانا کی ناشتہ کی دعوت کی۔ میں اس نشاشہ میں مدعو تھا یہ مجلس ناشتہ کے دوران گفتگو سے عبارت ہے مگر حضرت مولانا نے اس میں ایک اہم واقعہ بیان فرمایا ہے اس لیے اس مجلس کی روداد پیش کی جارہی ہے) احتشام ندوی)

۲۸ر دسمبر ۱۹۷۸ء

آج صبح میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ملنے کے لیے حاجی ڈاکٹر عبدالغفور صدر ایم ای ایس کے گھر پہونچا۔ ڈاکٹر عبدالغفور موجود تھے ان کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے سکریٹری عبدالسلام صاحب پرنسپل ممپاڈ کالج میں موجود تھے۔ پرنسپل صاحن نے کہا کہ وہ ایک سال کی چھٹی لے کر مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی خدمت میں ہمہ وقت مشغول رہتے ہیں۔ آج ڈاکٹر عبدالغفور نے حضرت مولانا کو ناشتہ کی دعوت دی تھی جس کی وجہ سے اچھا خاصہ مجمع وہاں ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کار سے تشریف لائے، ان کے ساتھ قدرت اللہ مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی صاحب اور بہت سے لوگ تھے ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اس سے قبل مولانا نے مجھ سے اپنا ایک اہم واقعہ بیان کیا تھا جو مکمل نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو فرمایا کہ اگر پروفیسر محمد شفیع صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے میری زندگی کا رخ نہ بدل دیا ہوتا تو میں ادبی موضوعات پر اپنی صلاحیتں

صرف کرتا اور اسام کی خدمت کا شرف حاصل نہ کر سکتا۔ (اس سے قبل حضرت مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر میں ادب پر کام کرتا تو ہزار دو ہزار اسومی مجھے جانتے ہوتے مگر اب تو پورا عالم اسلام مجھ کو جانتا ہے اور یہ حق ہے کہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کتاب کی وجہ سے عام عرب بھی مولانا کو جانتا ہے یہ جملہ معترضہ تھا)

فرمایا اگر میں اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ کی خدمت میں لاہور گیا اس وقت میری عمر بارہ، پندرہ برس کی ہوگی۔ ہمارے اکثر اعزہ کا خیال تھا کہ اس وقت کی پر کشش ملازمت ار منصب آئی اسی ایس کے امتحان میں بیٹھنا تھا اس لیے فراہم ذہین طالب علم کو عربی میں عمر کو ضائع نہ کرنے چاہیے برحال خاندان میں کوئی فیصلہ میرے بارے میں نہ ہو سکا تھا۔ میرے پھوپھا مولانا سید طلحہ نے پروفیسر محمد شفیع کے سامنے میرا مسئلہ رکھا وہ صاحب الرائے تھے اور یورپ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان سے میرے پھوپھا نے میرے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ پروفیسر شفیع صاحب نے کہا کہ کل صبح کو آپ دونوں ہمارے گھر آجائیے اور ساتھ ناشتہ کیجیے اس وقت تفصیل سے گفتگو ہوگی اور سارے حالات معلوم کر کے مشورہ دے سکوں گا۔

فرمایا ویسے پروفیسر شفیع صاحب عام طور سے گھر کی وعدت نہیں دیتے تھے مگر میرے معاملہ میں خصوصی توجہ فرمائی اور صبح کو میرے شائع شدہ مقالات عربی میں دیکھے اور جو میں نے مقالات لکھے تھے سب دکھلائے۔ انہوں نے میری صلاحیت کا اندازہ کر لیا۔ پھر وہ بولے کہ آپ عربی ہی کو اپنا موضع حیات بنائے اور عربی پر اپنی صلاحیت صرف کیجیے، مگر انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کو تحصیل ہی کیجیے۔ فرمایا کہ انگریزی کو کچھ ہوگی مگر فرانسیسی نہ پڑھ سکا۔

میں نے عرض کیا کہ جب مولانا عبدالسلام قدوائی نے ندوہ میں عربی پڑھنی شروع کی تو ان کے دادا جو خود جاہل تھے بولے کہ تو ملا بن جائے گا اور گھر گھر بھیک مانگے گا۔ مولانا مسکرائے اور فرمایا انگریزی کے اانے کے باعث ہندوستان میں عربی کی بڑی ناقدری تھی پھر فرمایا کہ ماشاء اللہ مولانا عبدالسلام قدوائی کو کبھی ملازمت کی کمی نہ رہی (وہ پہلے ناظم دینیا جامعہ ملیہ میں تھے اور اب) دارالمصنفین میں ملازم ہیں اور ان کے بچے سب اچھے حال میں ہیں اور ملازم ہیں۔ فرمایا کہ دارالمصنفین کے جلسوں میں تنخواہ بڑھانے کی بات میں کرتا ہوں تو مولانا قدوائی پناہ مانگتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ میری تنخواہ نہ بڑھاتے جو ملتا ہے وہ بہ کافی ہے۔ مولانا نے پھر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ خود مجھے بھی آج تک پیسوں کی زحمت نہیں ہوئی۔

میں اور مولانا گفتگو میں منہمک تھے مگر ڈاکٹر عبدالغفور صاحب مولانا سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے لہٰذا میں خاموش ہو گا میں نے اپنی بات روک دی تو وہ دونوں گفتگو کرنے لگے۔

اب مولانا کے ساتھ ہم سب ایک ہال میں آئے جہاں ناشتہ کا انتظام تھا مولانا کو زکام تھا مگر وہ کیلا کھانا چاہتے تھے میں نے کہا کہ زکام میں کیلا نہ کھائے۔ یہ سن کر ڈاکٹر عبدالغفور بولے کہ آپ کیلا زکام میں کھائیے۔

چونکہ وہ مشوہر معالج ہیں لہٰذا مولانا نے کیلا کھایا۔ چونکہ ڈاکٹر عبدالغفور ناشتہ نہیں کرتے تھے وہ میزبانی کرتے رہے اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوکر قصوری خاندان کے قائم کردہ جے۔ ٹی ڈی اسلام پہونچے۔ وہ یتیم خانہ تھا۔ اس کا پورا نام ہے (جمعیۃ التبلیغ ودعوۃ الاسلام ہے) حضرت مولانا دفتر میں بیٹھ گئے اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی سے فرمایا کہ مولوی عبدالماجد عظیم آبادی نے جو عبارت اردو میں لکھی ہے اس کو عربی میں لکھ کردیجیے اور میں دستخط کردوں گا۔ ایسا ہی ہوا۔ حضرت نے دستخط کردیا اور تاریخ ڈال دی۔ پھر منیجر صاحب نے دعا کی درخواست کی۔ حضرت ملانا نے چند آیتیں پڑھ کر دعا کی اور ہم لوگ باہر آگئے کر کھڑی تھی میسور جانے کے لیے۔ مولانا نے کئی لوگوں سے معانقہ اور مصافحہ کیا آخر میں میری باری ہے اور حضرت نے معانقہ اور مصافحہ سے نوازا اور پھر فرمایا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے بچوں کو نہیں دیکھ سکا۔ میں عرض کیا کہ مجھے قلق ہے کہ بخارہ جانے کے باعث آپ میرے گھر تشریف نہ لا سکے۔ اب میں یہ دعوت تو سینڈی ضلع رائے بریلی منتقل کرتا ہوں فرمایا کہ اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ میں لکھنؤ میں آپ کی دعوت کروں۔ میں نے عرض کیا یہ نصیحت تو مجھے میسر ہے جب بھی ندوہ جاتا ہوں یہ شرف حاصل ہوتا ہے۔

حضرت مولانا نے چار دن کالی کٹ میں قیام فرمایا جس کی وجہ سے بڑی رونق رہی۔ ان کی وجہ سے پردیس میں قیام کا احساس جاتا رہا۔ عجب پر رونق گذرے۔ جو پر نور محفلیں شمال ہند میں نظر آتی ہیں ان کے نور جنوبی ہند تک پہونچ گیا اور یہ بقیہ ارض چند دن کے لیے روشن ہوگیا۔ دوران گفتگو میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی میں سنی دینیات کی پروفیسر شپ پیش کی تھی فرمایا کہ اس سے بڑی آزمائش تو اس وقت ہوئی جب مدینہ یونیورستی نے پروفیسر شپ پیش کی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے ندوہ کی خدمت کو ترجیح دی پھر فرمایا کہ ملازمت کرنے سے آزادی نہیں رہتی اور بہت سی پابندیاں عائد ہوجاتی ہیں۔

☆

ادب بسر کرنا/ ادب میں بسر کرنا*

پروفیسر محمد علی جوہر
شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ادب آدمی کو انسان بناتا ہے۔ ادب ہمیں مسرت بھی دیتا ہے اور بصیرت بھی۔ ادب ہمارے جذبات کی تسکین کے ساتھ اُن کی تطہیر بھی کرتا ہے۔ ادب ہماری زندگی کا ترجمان بھی ہے اور نقاد بھی۔ ادب دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے تو ادیب سیکولرزم کا سب سے بڑا علَم بَردار۔ ادب کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے اور فنونِ لطیفہ سے انسان کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اِس لئے انسانوں کی اکثریت کا ادب دوست ہونا فطری بات ہے۔ انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی ادب میں ہوتی ہے اور اِس طرح ادب ہمارے جذبوں کو زبان عطا کرتا ہے۔ ادب ہمیں ایک اور زندگی جینے اور اِس حقیقی دنیا سے ماورا ایک ایسی متوازی دنیا میں پناہ لینے کا موقع فراہم کرتا ہے، جہاں نمرود وقت یا شدادِ زمانہ کا کوئی حکم نافذ نہیں ہوتا۔

خالقِ کائنات نے اپنی بہترین تخلیق ''انسان'' میں خلاّقیت کا جوہر بھی شامل کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ابتدائے آفرینش سے آج تک عرضِ ہنر کے لیے نئے سانچے تیار کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی تیار کرتا رہے گا۔ فطرت اگر پہلی فن کار ہے تو یہ دنیا فطرت کی شاہکار تخلیق ہے۔ فطرت کی پیروی یا نقالی روزِ اول سے انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور اسی رجحان نے دنیا کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ اس حسین و دلچسپ اضافہ کا ایک نمونہ اقبالؔ کی نظم ''محاورہ مابین خدا و انسان'' میں انسان کے حسبِ ذیل جواب میں پیش کیا گیا ہے :

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم | سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی | خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگِ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

تو نے رات پیدا کی، میں نے چراغ پیدا کیا۔ تو نے مٹی پیدا کی، میں نے اُس سے خوبصورت پیالے بنائے۔ تو نے بیابان، کہسار اور جنگل پیدا کئے۔ میں نے خیابان و گلزار اور باغ پیدا کئے۔ میں وہ ہوں جو پتھر سے آئینہ پیدا کرتا ہوں۔ میں وہ ہوں جو زہر سے نوشینہ یعنی تریاق زہر تیار کرتا ہوں۔

اقبالؔ نے اپنی ایک اور نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور تخلیقی جوہر کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی اس نظم کا آخری بند اس طرح ہے ۔

تابندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے | تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے | محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے

ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

*''مذاکرہ کے جس موضوع کا آغاز پروفیسر طارق چھتاری نے کیا تھا، آج اسی سلسلہ کی یہ دوسری کڑی پیش ہے''۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اِس عہد میں یہ ظاہر کرنے اور اِس خیال کو حاوی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ادب پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن یہ فریبِ نظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے ادب کی معنویت قائم رہے گی، اور جب تک ادب کی معنویت قائم رہے گی، ادب کے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ادب کا طرزِ گفتار سائنس دانوں کی سوچ اور طرزِ اظہار سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً غربت و افلاس سے تنگ آ کر ایک غیرت مند شخص زہر کھا کر خودکشی کر لیتا ہے تو سائنس یہ رپورٹ پیش کرتی ہے کہ ''اِس شخص کی موت زہر خوری سے ہوئی ہے۔'' اِسی واقعہ پر ایک ادیب کا فیصلہ اِس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ اُس کی موت کا سبب زہر کے بجائے اُس کی غریبی اور مفلسی بتاتا ہے۔ سائنسی فیصلے بصارت پر مبنی ہوتے ہیں تو ادبی فیصلے بصیرت پر۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بصارت کے مقابلے بصیرت کا مقام بلند ہے۔ یعنی صاحبِ بصیرت اربابِ بصارت سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔

جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی نے دنیا اور انسانیت کے لئے سنگین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ سولہویں صدی میں کلیسا اور مذہب کے درمیان جو کشمکش پیدا ہوئی اُس کے ردِ عمل کے طور پر سائنس نہ صرف مذہب کی حریف بن گئی بلکہ اخلاقی اور ادبی اقدار سے بھی بیزار ہو گئی اور یہ بیزاری آج تک چلی آ رہی ہے۔ آج کی سائنس میں جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، اُسے ضرور کرنا چاہیے کہ رہنما اصول پر کام کرتے ہوئے اخلاقی اور مذہبی حدود سے تجاوز تو کرتی ہی ہے، فطرت سے بھی چھیڑ چھاڑ کرتی نظر آ رہی ہے اور اِس بات کی مطلق پرواہ نہیں کرتی کہ موجودہ سائنسی تحقیقات اور اُس کی بے لگام ترقی کے انسانی سماج اور انسانی رشتوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ مغربی دنیا کی مذہب و اخلاق سے بیزاری نے صنعتی انقلاب تو پیدا کر دیا لیکن اُس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مادہ پرستی نے اخلاقیات اور انسانیت کے تانے بانے بکھیر دیے۔ آج کے صارفی سماج کو (جہاں دنیا کی ہر چیز بکتی ہوئی نظر آ رہی ہے) اُسی مادہ پرست معاشرے نے جنم دیا ہے۔

جدید سائنس اور ٹکنالوجی نے ماحولیاتی توازن کے نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ آج کی مہذب دنیا انسانیت کے تحفظ و بقا سے زیادہ اِس کی تباہی کے سامان پر توجہ، طاقت اور توانائی صرف کرتی نظر آ رہی ہے۔ بڑی طاقتیں بارود کے بڑے بڑے ذخیرے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ نیوکلیر بم، جراثیمی ہتھیار پر قومی آمدنی کا بڑا حصہ صرف کیا جا رہا ہے۔ جینٹک ٹیکنالوجی کے میدان میں دھماکہ خیز دریافتیں سامنے آ رہی ہیں اور بعض ترقی یافتہ ممالک نے ہیومن کلوننگ کے ذریعہ مصنوعی انسان کی صنعت قائم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اور دنیا تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے، جس میں کثرت سے نیوکلیر اور جراثیمی بموں کا استعمال ہو سکتا ہے۔

چنانچہ صارفیت زدہ ماحول، گمراہی اور ہٹ دھرمی کے اِس خوف ناک دور میں جہاں مذہب و اقدار کے سارے حوالے بے معنی ہوتے جا رہے ہیں، انسانی رشتوں کی بحالی اور انسانی قدروں کے تحفظ و بقا کے لئے اگر کسی طبقے کا کردار بامعنی نظر آتا ہے تو وہ شاعروں ادیبوں کا طبقہ ہے۔ آج متمدن دنیا کی ترقیٔ معکوس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم آج بھی دورِ ناشائستگی میں جی رہے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو یہی زمانہ صحیح معنوں میں شعر و ادب کے فروغ کا زمانہ ہے۔ چونکہ ادیب معاشرے کا ضمیر بھی ہوتا ہے اور روحِ عصر کا ترجمان بھی، لہٰذا اِس پُر آشوب دور کے اخلاقی اور تمدنی بحران سے باہر نکلنے کے لئے کوئی راہ کہیں کھلتی ہے تو وہ شعر و ادب کی دنیا کے اندر ہی کھلتی ہے۔ میں اپنی ذات میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ ادب کے مطالعے کا ہی فیضان ہے کہ ہم انسانیت کے اِس دور کے رشتے پر گفتگو کر رہے ہیں جو اہلِ ادب کو وراثت میں ملا ہے۔

***

دانشوری کی نئی لہریں

(انتخاب: ڈاکٹر شائستہ خان)

● بحث کے **موضوعات**: ادب، کلچر اور خرد افروزی (۲) ادب، کلچر اور عالم گیریت (۳) ادب، کلچر اور روشن خیالی (ادب سوشل سائنسز کا حصہ)۔

● **بحث میں حصہ لینے والے**: نثار عزیز بٹ، انور احمد، اصغر ندیم سید، محمود شام، آصف فرخی، سرمد صہبائی، غالب احمد، مسعود اشعر، افتخار عارف، جاوید شاہین، گورنر خالد مقبول، اثر محمد خاں، قاضی جاوید۔

☆ پوری دنیا کا 'آج' بڑی حد تک مشترک ہو چکا ہے اور فاصلے تقریباً ناپید ہیں (نثار عزیز بٹ)۔

☆ مجید امجد نے تخلیقی عمل کو عملِ خیر کہا ہے۔ (انوار احمد)۔

☆ پرولتاری آمریت ہو یا دوغلی جمہوریت (اصغر ندیم سید)۔

☆ روشن خیالی نے نائن الیون کے بعد جنم لیا (اصغر ندیم سید)۔

☆ اُس وقت اہل قلم کو معاشرے میں وہی اہمیت اور مقبولیت حاصل تھی جو آج کرکٹر اور ٹی وی اسٹارز کا مقدر ہے (محمود شام)۔

☆ Think globally, act locally، اس نعرے پر مجھے راجندر سنگھ بیدی کی ایک گفتگو یاد آ رہی ہے...... Art has got to be international in form and national in content. گوئٹے کی اصطلاح، عالمی ادب (آصف فرخی)۔

☆ گلوبلائزیشن دراصل امریکانائزیشن ہے (آصف)۔

☆ ''جنگ و جدل کے بجائے فیلڈس آف کو اکزسٹینس کی تلاش'' ایڈورڈ سعید کے نزدیک دانش وری ہے۔

☆ اللہ ایک ہے مگر توحید کا مطلب یہ تو نہیں کہ صرف اللہ ایک ہے۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ بندہ بھی ایک ہے سماج بھی ایک ہے اور ذرائع پیداوار بھی ایک ہیں (سرمد صہبائی)۔

☆ لیکن ہم نے شہزادی ڈیانا کو بڑی فراخ دلی سے اس کے سکرٹ میں بادشاہی مسجد کی سیر کروائی ہے (سرمد)۔

☆ فوکو ہاما صاحب نے اینڈ آف ہسٹری کو تو دیکھ لیا لیکن بیگننگ آف ہسٹری کو نہیں دیکھا (سرمد صہبائی)۔

☆ یہ گلوبلائزیشن کا ہیڈ آفس ہے، بگ برادر بڑی کرسی پر بیٹھا ہے، اس کے چاروں طرف کمپیوٹر ہیں، اس کا ماؤس ساری دنیا کا تعاقب کر رہا ہے: بگ برادر اِز واچنگ، واچنگ، واچنگ۔ اچانک اس کے سامنے ایک مجذوب ظاہر ہوتا ہے اور کمپیوٹر کی سکرین کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے: ایں چیست؟ بگ برادر جواب دیتا ہے: یہ وہ چیز ہے جس کا تمہیں علم نہیں۔ مجذوب اسکرین کو غور سے دیکھتا ہے، اسکرین کو آگ لگ جاتی ہے۔ وہاٹ اِز دِس، بگ برادر پوچھتا ہے۔ مجذوب کہتا ہے: ''یہ وہ چیز ہے جس کا تمہیں علم نہیں۔'' (سرمد صہبائی)۔

☆ ایک وجود کی موت اس وقت ہوتی ہے جب جسم کا رشتہ روح کے ساتھ 'وحدت' کا نہیں رہتا (غالب احمد، زندہ پسر بیدار: حی بن یقظان)۔

☆ اعجاز احمد کا موقف ہے کہ ''سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد سے ایک ہی نظام عالمی بننے کے لیے رہ گیا ہے، وہ ہے امپیریلسٹ کیپٹل۔ باقی ساری دنیا کی عافیت اس میں ہے کہ اسے قبول کر لے (آصف فرخی)۔

☆ پال ہل سول اپنی کتاب ماڈرن ہسٹری سورس بک میں کہتا ہے کہ اپنے اوپر خود مسلط کیے ہوئے دوسروں کے افکار یا خود مسلط کردہ دوسروں کی سرپرستی سے انسان کی آزادی ہی خرد افروزی ہے۔ اسے دوسروں کا دست شفقت بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر مسلط کیے ہوئے افکار کو 'سیلف اِنکرڈ ٹیوٹلیج' کہتا ہے۔ آپ اسے اندھی تقلید کہہ لیجیے۔ یہ تقلید انسان کی وہ نااہلی ہے جو اسے دوسروں کی انگلی پکڑے بغیر اپنا راستہ تلاش نہیں کرنے دیتی۔ (مسعود اشعر)۔

☆ روشن خیالی کی اصطلاح سماجیاتی حوالے سے ایک انسان دوست، روادار اور غیر فرقہ وارانہ سماج کو اپنا آدرش بناتی ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کا احترام، اختلافی نقطہ ہائے نگاہ کے لیے برداشت، اور مساوات کی اساس پر انسانی برادری کا قیام، پرامن بقائے باہمی، فنون لطیفہ کا فروغ، مکالمہ اور تعامل کے لیے گنجائش، اور معاشی انصاف کا حصول اس کی بنیادی اقدار ہیں۔ یہ غیر معمولی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ذہنی اور تہذیبی ورثہ میں یہ اقدار ہمیشہ شامل رہے ہیں۔ علمائے دین کے ایک قابل احترام گروہ اور

کم وبیش سبھی صوفیائے کرام نے نہ صرف ان اقدار کا پرچار کیا بلکہ ان کی شخصیت اور زندگی، ان کا عملی نمونہ تھی۔ ہمارے صوفیانہ ادب اور ہماری شاعری کا فکری مشتملہ ہمیشہ سے انہیں اقدار سے عبارت رہا ہے۔ خسرو سے غالب تک کی شاعری، اور ہجویری سے اقبال تک کے فکرودانش میں ان اقدار کو اجاگر کیا گیا ہے۔ (افتخار عارف)۔

☆ موجودہ عالم گیریت، سامراجیت کی ایک بدترین شکل ہے (جاوید شاہین)۔

☆ گورنمنٹ کالج سے وابستہ، **اساتذہ یا اولڈ بوائز** : اقبال، محمد حسین آزاد، نوبیل یافتہ ہر گوبند کھرانہ (کیمسٹری)، ڈاکٹر عبدالسلام، (فزکس، وریاضی) : فیض، راشد؛ آربی چوپڑا، کامنی کوشل، بلراج ساہنی، دیوانند، بھیشم ساہنی، چیتن آنند، ضیاء محی الدین، صفدر میر، رفیع پیرزادہ، امتیاز علی تاج، اُرمیلا سوندھی، عثمان پیرزادہ، سلیمہ ہاشمی، شعیب ہاشمی، ثمینہ احمد، پطرس، خوشونت سنگھ، صوفی تبسم، کنہیالال کپور، حنیف رامے، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، راجہ غالب احمد، سرمد صہبائی، محمود شام، مظفر علی سید، جیلانی کامران، حفیظ ہوشیار پوری، کشور ناہید، خالد آفتاب وی سی۔

☆ صوفیانہ فکر اور روحانی دانش، ہمارے ادب کی بنیاد۔ صوفیا انسان کو محبت امن اور رواداری کا درس دیتے رہے۔ اس طرح یہ خطہ تہذیبی اور سماجی سطح پر ان ہی عقائد کے احترام میں پروان چڑھتا رہا۔ اور انسانی رشتوں میں ایک دوسرے کی برداشت، اور دوسروں کے عقائد کے احترام کا کلچر مستقل روایت بن گیا۔ (گورنر خالد مقبول)۔

☆ یہ دیکھنا اور اطمینان کرنا ہوتا ہے کہ کیا وہ اس آزادی کو ذمہ داری کے ساتھ برت رہا ہے۔ اپنے ہمسایہ کی کسی محترم شے، علامت، ٹوٹم یا شخصیت کے لیے کسی پیر، مہنت، نبی، اوتار یا معبود کے لیے کسی بھی اعتبار سے ناپسندیدہ، تلخ اور اہانت آمیز مواد تو نہیں پھیلا رہا ہے؟ مہذب لوگ اظہار کی آزادی کے نام پر اس طرح کا سفلہ پن روا نہیں رکھتے (اسد محمد خاں)۔

☆ دنیا ایک عالمی گاؤں بن رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں لوکلزم کی قوتیں ہیں وہ اس عالمی گاؤں کو محلوں اور بلاکوں میں تقسیم کر رہی ہیں (قاضی جاوید)۔

(تحقیق نامہ، ۲۰۰۷ء، منتخب مقالات انٹرنیشنل کانفرنس ۲۰۰۶ء، شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی لاہور)

☆

چودھری خوشی محمد ناظر

ڈاکٹر انوار احمد
(سابقاً دہلی یونیورسٹی کے محترم و محبوب استاد)

ڈاکٹر انوار احمد خوشی محمد ناظر صاحب مرحوم کے قریب ترین عزیزوں میں ہیں جنہوں نے ہماری درخواست پر ناظر کے بارے میں بہت اہم اطلاعات قلمبند کر دی ہیں ان کی شکر گزاری ہم پر واجب ہے ۔ ڈاکٹر صاحب دلّی کالج کے نامور اساتذہ میں رہے ہیں، اور ہنوز دلی کے ادبی حلقوں میں معروف، مانوس اور مقبول شخصیت ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ (ادارہ)

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

ناظر کی ایک نظم 'تاج محل' پر ہے، طالب علمی کے زمانے کی یہ یادگار نظم مسدس کے فارم میں ہے۔ ہر بند کے دو شعر اُردو میں اور تیسرا شعر فارسی میں ہے۔ نظم کا آخری شعر موقع و محل کی مناسبت کے پیش نظر اوپر درج کیا گیا ہے۔

ناظر پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام مولا داد خاں تھا۔ آپ موضع ہریہ والا ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ آپ کے تین بیٹوں میں خوشی محمد ناظر سب سے چھوٹے تھے۔ ناظر کی تاریخ پیدائش 1872ء ہے۔

ناظر نے میٹرک کا امتحان پنجاب سے پاس کیا اور پھر ایم.اے.او. کالج علی گڑھ میں 4/جون 1889ء کو داخلہ لیا۔ علی گڑھ سے انھوں نے 1893ء میں بی.اے. کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا، اس سلسلے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مندرجہ ذیل خبر شائع ہوئی:

"بی.اے. اور انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ بہت ہی عمدہ ہے۔ ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے کالج کے طالب علم خوشی محمد بی.اے. امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے اور انگلش اور فارسی دونوں زبانوں میں آنرز کا درجہ لیا۔ انھوں نے طلائی تمغہ پانے کا اپنے کو پورا مستحق ثابت کیا ہے اور اُمید ہے کہ وہ اُنہی کو ملے گا۔ (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 2/مئی 1893ء)

مولانا سیّد سلیمان ندوی اور عاشق حسین بٹالوی نے ناظر کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ قد چھ فٹ تین انچ، بدن چھریرا، رنگ گورا، ناک کھڑی اور لمبی، ڈاڑھی

جوانی میں چھوڑی، مونچھیں شروع ہی سے صاف نہیں کرتے تھے۔ عموماً سوٹ اور تر کی ٹوپی پہنتے تھے۔

ناظرؔ علی گڑھ میں بہت فعال شخصیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ حیاتِ آفتاب میں چھپے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ (انجمن اخوان) یعنی ''ایم.او. کالج برادرہڈ'' کی بنیاد رکھنے کا فخر ناظرؔ کو حاصل تھا۔ بعد میں اس کا نام بدل کر ''اولڈ بوائے ایسوسی ایشن'' کر دیا گیا۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جلسوں میں ناظر پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ 1898-99ء کے اولڈ بوائز ڈنر میں ناظرؔ نے ایک نظم پڑھی جس کا مصرعہ تھا ع

''آئی ہیں میکے میں ملنے کو سہاگن بیٹیاں''

(اولڈ بوائے، فروری 1911ء)

اپنی شاعری کی وجہ سے علی گڑھ میں 'بلبل پنجاب' کے نام سے مشہور تھے۔ 5/جنوری 1892ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مندرجہ ذیل قطعہ شائع ہوا تھا ۔

از تو خوش وقت است بزم دوستاں
مرحبا اے ناظر شیریں بیاں
در بہاراں گلفشانی می کند
بلبل پنجاب در ھندوستاں

ایس. کے بھٹناگر نے اپنی کتاب میں ناظرؔ کو 'کالج کا پوئٹ لاریٹ' لکھا ہے۔ علی گڑھ سے ناظرؔ کو خاص محبت اور لگاؤ تھا۔ ایک موقع پر ناظر نے مالیر کوٹلہ میں زبردست تقریر کی اور نتیجہ میں علی گڑھ کے لئے کثیر چندہ جمع ہو گیا۔ اس کا اعتراف محسن الملک نے رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مطبوعہ 1899ء میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''منجملہ اوّل تعلیم یافتہ نوجوانوں کے جن سے قوم کی اُمیدیں وابستہ ہیں اور جو بہت کچھ ہونہار معلوم ہوتے ہیں ایک چودھری خوشی محمد صاحب تعلیم

یافتہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ہیں...... سرسیّد میموریل فنڈ میں جو کامیابی
مالیر کوٹلہ میں ہوئی وہ اسی نوجوان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔'

ناظر نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ قوم کی ہمدردی اور بھلائی میں صرف کیا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے، ان کی بیشتر نظمیں ان کے اس طرح کے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ غریبوں پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت انھوں نے اپنے عہد گورنری میں رشوت اور بیگار کو ختم کیا۔ ان کی انہی قومی، علمی اور ادبی خدمات کے صلہ میں 1912ء میں حکومت کی طرف سے 'خاں صاحب' کا خطاب ملا۔ اور 1917ء میں ان کی مزید قومی، علمی، ادبی اور سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں 'خان بہادر' کا خطاب عطا ہوا۔ یہ دونوں خطاب اُنہیں اُس وقت ملے جب وہ کشمیر میں گورنر تھے۔

ناظر کی ملازمت کا آغاز علی گڑھ سے ہوا، جہاں انھوں نے کچھ دن علی گڑھ کالج میں استاد کے فرائض انجام دیئے۔ اس سلسلے میں ''اولڈ بوائے'' کے ایڈیٹر سیّد محمد خاں بی.اے. علیگ لکھتے ہیں:

''خوشی محمد خاں صاحب علی گڑھ کے بہترین شعرا میں رہے... بی.اے. کے بعد چندروز کے لئے مارننگ اسکول کے ہمارے استاد رہے۔''

ناظر کی باقاعدہ ملازمت کا آغاز ریاست لوہارو سے ہوتا ہے۔ جہاں وہ لوہارو خاندان کے بچوں کے اتالیق بھی رہے۔ اور نواب صاحب لوہارو کے پرائیویٹ سکریٹری بھی رہے۔ اس کے بعد 1899ء میں کچھ عرصہ بعد نواب صاحب ممدوٹ کے بھی اتالیق رہے۔ اس کے بعد 1901ء میں ریونیو کمشنر کے پرسنل اسسٹنٹ ہو کر کشمیر چلے گئے۔ جہاں وہ ترقی کر کے گورنر اور بعد میں ریونیو منسٹر ہوئے۔ اور 1924ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ کشمیر میں ملازمت کے دوران اُن کا سب سے بڑا کارنامہ رشوت اور بیگار کو ختم کرنا تھا۔ ہم یہاں تفصیل میں نہ جا کر کشمیری میگزین میں شائع ایک مضمون سے چند سطور قلم بند کرتے

ہیں۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

''اللہ اللہ سالِ گذشتہ سے ہر ایک سفید پوش جس کے دل میں خوفِ خدا نہ ہوتا تھا وہ ملک میں ہر راہ چلتے کو دو چار جوتے لگا کر بیگاری پکڑ سکتا تھا مگر موجودہ گورنر کے زمانے کی برکت سے اب سرکاری ملازم بھی کسی کو بیگاری نہیں پکڑ سکتے۔''....

''خطہ کشمیر کے ملازمین گورنر صاحب کو خدا کی طرح حاضر و ناظر سمجھتے ہیں ... چودھری خوشی محمد صاحب رعایا اور ملازموں کے حالات بھیس بدل کر معلوم کرتے رہتے ہیں... جہاں جہاں دیہات میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے لوگ عہد نوشیرواں سے چودھری صاحب کی گورنری کو منسوب کرتے ہیں۔''

کشمیر کے بعد ناظرؔ نے ریاست رام پور میں کچھ عرصہ...افسر نو آبادیات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ دسمبر 1925ء میں اُن کا تقرر عمل میں آیا۔ 1926ء میں اُنہیں کچھ مزید اختیارات عطا ہوئے۔ گزٹ ریاست رام پور 19 راگست 1926ء میں لکھا ہے کہ:

''حسب رپورٹ ریونیو سکریٹری بہادر خاں بہادر چودھری خوشی محمد ناظر صاحب افسر نو آبادی کو اختیارات کلکٹری و مہتمم بندوبست عطا کئے جاتے ہیں۔''

لیکن ناظرؔ رام پور میں زیادہ عرصہ نہ رُک سکے۔ جنوری 1929ء میں ملازمت ترک کر دی۔ اس طرح اُن کی مختلف ریاستوں میں کل مدّت ملازمت تقریباً 35 سال رہی۔

ناظرؔ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی رام پور میں ایک بیوہ سے کی۔ یہ بیوہ میری والدہ کی بڑی بہن تھیں، ان سے ناظرؔ کی ایک لڑکی امریکہ میں کسی جگہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ قیام پذیر ہے۔

پہلی بیوی سے آٹھ اولادیں تھیں۔ چھ لڑکے اور دو لڑکیاں۔ چھوٹے صاحبزادے

چودھری اکرام اللہ خاں کے ساتھ میری بڑی بہن کی شادی ہوئی تھی۔اب میری بہن اور چودھری اکرام اللہ خاں دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ان کے بچے کچھ لاہور میں اور دو امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔

ناظر کی تصانیف:

1. اخوت: یہ نظم طالب علمی کی یادگار ہے۔یہ دوسری نظم ہے جس پر آرنلڈ نے انہیں انعام مرحمت فرمایا تھا۔یہ نظم غالباً 1893ء میں طبع ہوئی تھی۔
2. مرثیہ سرسیّد مع شکوہ کالج: یہ مرثیہ سرسیّد کی وفات پر لکھا تھا۔1898ء میں رفاہِ عام پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔اس کے ساتھ اُن کی ایک اور نظم بعنوان شکوہ کالج درج ہے۔یہ نظم انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے میرٹھ کے اجلاس میں پڑھی تھی۔
3. یادگارِ اکبر: یہ بارہ صفحات کا کتابچہ ہے،جس میں صاحبزادہ معزالدین احمد اکبر میرزا کے حالات، پھر تہنیت،عقد نکاح اور پھر چار صفحات میں مرثیہ درج ہے۔یہ کتابچہ صدائے ہند پریس لاہور سے طبع ہو کر 1900ء میں شائع ہوا تھا۔
4. یادگارِ قیصری: یہ قصیدہ ایڈورڈ ہفتم کی شان میں لکھا گیا تھا۔یہ قصیدہ محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے سولہویں اجلاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا تھا۔اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہیں ہے۔منشی دین محمد صاحب نے یہ قصیدہ یادگارِ دربار حصہ اوّل میں شائع کیا ہے۔یہ کتاب لاہور سے 1903ء میں شائع ہوئی تھی۔
5. ایک کتاب ناظر نے لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے اس زمانہ کی ضرورتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے تصنیف کی تھی۔ناظر کی یہ کتاب ملتی نہیں،نہ تو اس کا مسودہ دستیاب ہو سکا اور نہ ہی یہ پتہ چل سکا کہ یہ کتاب طبع ہوئی بھی یا نہیں۔ناظر نے اس کا ذکر دسمبر 1900ء کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس رام پور کے اجلاس میں اپنی تقریر میں کیا ہے۔یہ تقریر 14/جنوری 1901ء کے اخبار' وکیل' میں شائع ہوئی تھی۔

6. سوانح عمری: اس سلسلے میں ناظرؔ نغمہ فردوس میں لکھتے ہیں:

"میری اکثر نظمیں خاص خاص مناظر مجالس اور واقعات و وارداتِ زندگی سے متعلق ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اپنے سوانح زندگی اور تغیرات ماحول کا بھی ذکر کیا جائے، جہاں تک ان کا میرے شغل شعر سے تعلق رہا ہے، مگر یہ سوانح اور ماحول کا قصہ ایسا دراز ہو گیا کہ ایک مستقل کتاب تیار ہو گئی۔"

یہ کتاب بھی غالباً طبع نہ ہو سکی اور نہ اس کا مسودہ باوجود انتہائی کوشش کے کہیں سے دستیاب نہ ہو سکا۔

7. مقدمہ و تبصرہ شعر و شاعری: اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے ناظر لکھتے ہیں:

"یہ خیال دامن گیر ہوا کہ مقدمہ شعر و شاعری کے انداز میں ایک مقدمہ حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں شاعری کے مختلف رائج الوقت نظریوں کے متعلق لکھا جائے۔ یہ مقدمہ اور تبصرہ بھی اس قدر پھیل گیا کہ اس کی ضخامت دو سو صفحے سے زائد ہو گئی۔"

یہ کتاب بھی دستیاب نہیں ہوئی۔

8. جوگی: اس کتابچہ میں نظم "جوگی" کے دونوں حصے شامل ہیں۔ وہ بھی جو 1902ء میں لکھا گیا اور وہ بھی جو 1932ء میں لکھا گیا۔ یہ کتابچہ لاہور کے گیلانی الیکٹرک پریس میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔

9. نغمہ فردوس حصہ اوّل: ناظرؔ کے مجموعہ کلام کا پہلا حصہ ہے۔ 1937ء میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے ناظم انجمن اربابِ ذوق لائل پور نے شائع کیا تھا۔ اس کی ضخامت 198 صفحات ہے۔

10. نغمۂ فردوس حصہ دوم: ناظرؔ کے کلام کا یہ دوسرا مجموعہ 1938ء میں گیلانی الیکٹرک

پریس لاہور سے چھپا اور ناظم انجمن اربابِ ذوق لائل پور نے شائع کیا۔
ناظؔر کا انتقال 1944ء میں ہوا۔ سیّد سلمان ندوی نے انتقال کی خبر سننے کے بعد تحریر فرمایا:

''کشمیر جنت نظیر کا ایک پھول یکم اکتوبر 1944ء کی رات کو مرجھا کر گر گیا، یعنی چودھری خوشی محمد ناظر نے اس تاریخ کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔''

(معارف، دسمبر 1944ء)

ناظؔر کا اردو شاعری میں کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خارجی شاعری میں داخلی جذبات و کیفیات کی آمیزش اور پیوندکاری سے اپنی نظموں میں ایک نئی شعری حسیت کو رواج دیا۔ بیانیہ نظموں میں فکر اور جذبہ کی گہرائی پیدا کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے تصوراتِ ہندی اور عقائد اسلامی کی بھی بڑی خوبصورت آمیزش کی ہے۔ ان تمام باتوں کے لئے انھوں نے تمثیلی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔ ان تمثیلی نظموں میں تصوف اور فلسفہ کی آمیزش بھی ہے۔ یعنی مناظر قدرت کے بیان میں اخلاقی و اصلاحی شاعری کی حسین آمیزش اور اس میں فکر و فلسفہ اور تصوف کی چاشنی پیدا کرنا اور تمثیلی پیرایہ بیان اختیار کرنا، یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

مرثیہ سرسیّد مسدس کے فارم میں ہے، اس مرثیہ میں پانچ بند ہیں۔ پہلے چار بند، بارہ بارہ اشعار پر مشتمل ہیں۔ لیکن آخری بند میں تیرہ اشعار ہیں۔ اس مرثیہ میں سرسیّد اور اُن کی زندگی سے وابستہ حقائق کا بیان کیا گیا ہے۔ سرسیّد ایک عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے۔ ناظؔر اُن کے ساتھ کافی عرصہ رہے تھے اور اُن سے ایک خاص عقیدت تھی۔ اس لئے ناظؔر پر اُن کی موت سے جو شدید اور گہرا اثر مرتب ہوا وہ اس مرثیہ کے ایک ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس مرثیہ میں ناظؔر نے سرسیّد کی، قوم کے لئے کی گئی مکمل خدمات کو سراہا ہے۔

• • •

۱۔ مرحوم ناظر کو کشمیر سے اس قدر وابستگی تھی کہ آخری آرام گاہ بھی کشمیر ہی کو بنایا۔ گگری بل میں پہاڑ کی اوٹ میں اپنی ہی کوٹھی میں (جو بعد میں چیف منسٹر صادق اور چیف منسٹر قاسم کی رہائش گاہ ٹھہری) ان کی قبر ہے۔

بچوں کے لیے سیرت نگاری ایک جائزہ

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

یہ سچ ہے کہ محمدﷺ کی حیات طیبہ کا ہر گوشہ نوع انسانی کے لیے لائق تقلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمﷺ کی زندگی کے ہر گوشہ پر سیرت نگاروں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ چنانچہ آپ کی زندگی سے جس قدر ہدایات وارنوابحالﷺ س کے لیے سبق آموز ہیں اسی طرح بچوں کی اصلاح وتربیت کے لیے ہے۔ مبصرین کا ماننا ہے کہ صدیوں تک بچوں کے ادب کو کوئی سماجی مقام حاصل نہیں تھا اس ادب کو بچوں کے لیے کافی سمجھا گیا جو بڑوں کے لیے تخلیق کیا گیا۔ جب کہ بچوں کے لیے ایسے ادب کی تخلیق وفراہمی لازمی ہے جوان کی اصلاح تربیت کا سامان فراہم کرسکے۔

بچوں کے ادب کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہو لیکن اس سے قبل جو دور گزرا اس میں امریکہ، انگلستان، روس، چین، فرانس، جرمنی اور ہندوستان وعرب بچوں کا ادب وہاں کی قوموں کے مخصوص مزاج ان کے مذہبی عقائد اور معاشرتی ضرورتوں کا آئینہ دار رہا ہے مغرب میں بچوں کے ادب کی بنیاد معاش اور معاشی خوشحالی دور ہے۔ اس کے برعکس مشرقی اور مسلم ممالک میں ادب اطفال میں بچوں کے اخلاق وکردار کو بلند کرنے کے لیے پندونصائح اور اخلاقی تعلیمات کو ذریعہ بنایا گیا۔ لاطینی ادب میں ہمیں ایک کتاب ایسی بھی ملتی ہے جو بچوں کی تربیت کے نقطہ نظر سے تحریر کی گئی ہے۔ Atoken of Childeon جسے عیسائی مبلغ جنیدے نے لکھا ہے اس طرح جال سنیار نے ۱۶۸۸ میں Prlgrimage Proteess لکھی۔ اسے بچوں کے لیے عیسائیت کی مشہور تبلیغی کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں فاتحین، مذہبی ہیرو اور مذہبی رہنماؤں کا تذکرہ ہے۔

بچوں کے لیے ابتدا میں جو کتب برصغیر میں تحریر کی گئی وہ زیادہ تر درسی کتب ہیں لیکن ان کا مقصد تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو ادب اطفال بھی تفسیر آشنا رہا ہے۔ بچوں کی کتب کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

دور اول، آغاز ۱۸۵۷ء یہ ادب اطفال کا ارتقائی دور ہے۔

دور ثانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء متحدہ ہندوستان میں بچوں کے لیے سیرت نگاری۔

دور ثالث: ۱۹۴۷ تا ۲۰۱۸ء

دور اول میں درسی کتب کا سراغ ملتا ہے کیونکہ اس دور میں زیادہ تر تعلیم بچون کو مدارس میں دیجاتی تھی۔ بچوں کے لیے جو سب سے پہلی کتاب تحریر کی اس کا نام نصاب الصبیان ہے یہ فارسی میں لکھی گئی اس کے مصنف ابوالفراس ہیں۔

اس کا مقصد تعلیم و تربیت ہے دوری کتاب ''خالق باری'' ہے اس ۱۲۵۳ھ امیر خسرو نے بچوں کی تربیت کے لیے لکھا۔ البتہ اردو میں بچوں کے ادب کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے اس زمانہ میں نو عمر افراد کے لیے متعدد کتب تصنیف کی گئی وہ زیادہ تر منظوم کلام پر مشتمل ہیں مثلاً خالق باری، ریزہ بالی، صفات باری، وغیرہ زیارہ تو اسکالر خالق باری نامی کتاب کو ہی ہندوستان کی سب سے قدیم اور پہلی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ جو بچوں کے لیے لکھی گئی۔ اس کے بعد بے شمار کتب نصف کی گئی۔ اس میں عبدالصمد بیدل کی کتاب حمد باری قابل ذکر ہے۔

اٹھارہویں صدی کی ابتداء میں میر تقی میر نے بچوں کے لیے نظمیں تخلیق کیں اردو کے ممتاز ترین شاعر ابتدا ہی سے بچوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ یہی وجہ تصنیف، یمنہ تعلیم و تربیت اخلاق و ذہنی تربیت ہی رہی ہے۔ میر تقی میر کے بعد نظیر اکبر آبادی نے بھی بچوں کے لیے ایام طفل اور معصوم بھدے بھالے کے نام سے اخلاقی نظمیں لکھی ان کے ہم عصر غالب نے بھی بچوں کے لیے قادر نامہ تحریر کیا۔

آزادی سے قبل سیرت نگاری

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی ہندوستان میں انگریزی تسلط کا مزید موجب ہوئی۔ اسی دور میں انگریزی کے زیر اثر ادب نو کی تشکیل کا رجحان ہوا جس نے ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو میں بچوں کے ادب پر بھی اثرات مرتب کیے۔ اس دور میں اردو میں بچوں کی تربیت بذریعہ ادب کرنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین کے ساتھ ساتھ مفتی محمد شفیع، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی اور الطاف حسین حالی نام قابل ذکر ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں منشی محبوب عالم نے بچوں کے لیے پہلا اخبار جاری کیا ہے۔ اس دور میں غلام احمد فروغی (۱۸۵۷ء) نے بچوں کے لیے قادر نامہ فروئی کتاب لکھی۔ محمد حسین آزاد نے (۱۸۶۱ء) نے ۱۸۶۱ء میں بچوں کے لیے، بہت کچھ لکھا ہے جس میں مشہور کتاب ''سلام علیک'' ہے اس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے بچوں کے لیے منتخب حکایات، حکایات لقمان اور چند پند (۱۸۹۶ء) میں شائع کیں۔ ان کتب کے اندر صحت و صفائی لالچ و تکبر کا خاتمہ ادب اور بات چیت کے انداز میں معلومات دی گئیں ہیں۔ سرسید احمد خاں کا ذکر بھی یہاں لازم ہے انھوں نے نوجوانان اخر میں مذہب اور پیغمبران کے متعلق بات چیت دی گئی ہیں۔

ہند کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ البتہ باقاعدہ بچوں کے لیے کوئی کتاب مرتب نہیں کی لیکن تہذیب الاخلاق میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین ملتے ہیں جو بچوں کے لیے مفید ہیں۔ تیز شبلی نعمانی نے بچوں کے لیے تربیت کے لیے مثنوی صبح امید اور عدل جہانگر جیسی اہم ترین کتب تحریر کیں۔

۱۸۹۴ میں اسماعیل میرٹھی نے اردو کی پہلی کتاب بچوں کے لیے تحریر کی اس کے علاوہ مضامین اور شاعری کے ذریعہ بچوں کی تربیت کا مواد فراہم کیا۔

برصغیر میں سیرت نگاری کا آغاز مولود ناموں سے ہوا جو ابتدا میں منظوم تھے۔ بعد میں نثری صورت میں سامنے آئے۔ ترمذی کی کتاب شمائل کو اردو میں سب سے پہلے مولانا کرامت علی جون پوری نے منتقل کیا اور اندر محمدی نام

رکھا یہ صرف ترجمہ نہ تھا بلکہ شمائل کی عمدہ شرح بھی ہے۔ یہ وثوق سے لیکن مشکل ہے کہ اردو ادب میں بچوں کے لیے سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء کب کیسے ہوا۔ البتہ بچوں کے ادب آغاز مغلیہ عہد سے ہوتا ہے اور بچوں کے لیے سیرت نگاروں کا آغاز انیسویں صدی سے ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے درمیانی عرصے میں بچوں اور نو جوانوں کے لیے خاصی تعداد میں کتب سیرت تحریر کی گئی ہیں۔ ان چالیس پچاس صفحات کی مختصر کتابیں بھی ہیں اور تین چار سو صفحات کی ضخیم کتب تھی۔ حفظ الضمن ہو یاروکی سیرت رسول کریم ﷺ، غلام رسول مہر کی سرورِ عالم ﷺ وغیرہ۔

یہاں یہ بھی بتا چلوں کہ ابتدا میں بچوں کے لیے سیرتی ادب منظوم صورت مین ملتا ہے جس میں نبی ﷺ کی نعت گوئی شامل ہے اور لوریوں کی صورت میں نبی ﷺ کی عظمت بچوں کے دل میں بٹھائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے قدیم ادب میں بچوں کے لیے سیرت کے موضوع پر کوئی کتاب باقاعدہ نثر میں نظر نہیں آتی البتہ ۱۸۶۵ء میں مرزا قاسمبیت نے تعلیم الاطفال کے نام سے کتاب لکھی جس میں پہلے خدا کی حمد پھر رسول ﷺ اور اصحاب رسول ﷺ کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کتاب کو سیرت النبی ﷺ پر لکھی گئی جزوی کتب میں شامل کر سکتے ہیں اور سیرت النبی پر لکھی گئی اولین کتابوں میں شامل ہے۔

مہر نبوت

یہ کتاب قاضی محمد سلیمان منصور نے تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی سال ہا سال سے یہ آرزو تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کی سیرت پر بچوں کے لیے کتاب لکھیں زور"مہر نبوت" اس آرزو کی تکمیل ہے۔ یہ کتاب ۲۳ سالہ نبوت کا خلاصہ ہے۔ مصنف نے محمد ﷺ کی حیات مبارکہ کے تمام پہلوؤں کو اختصار اور آسان پیرائے میں تحریر کر دیا ہے۔

تاریخ اسلام

یہ کتاب محمد میاں نے ۱۹۰۳ء میں تحریر کی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی سے بھی شائع ہوئی ہے یہ کتاب تین حصوں میں مشتمل ہے سوار جوابا لکھی گئی ہے۔ مصنف نے محمد ﷺ کی حیات مبارکہ سے متعلق ساز و سامان دیگر افراد خانہ، صحابہ صحابیات، غلام ولونڈیوں، جانوروں، ہتھیاروں کی معلومات فراہم کی گی ہیں۔

اسلامی تاریخ

اس کتاب کو ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری نے ۱۹۰۴ء میں تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے یہ کتاب نایاب ہے۔

مصنف نے لکھا ہے کہ:

اس کتاب کے لکھنے کا مجھے دو وجہ سے خیال پیدا ہوا۔ ایک تو میں نے دیکھا کہ اسلامی تعلیمات کے سلسلہ اردو میں کوئی کتاب متعلق احوال کریم آنحضرت ﷺ نہیں اگر کوئی ہے تو ایسی کہ اس خرد سال بچے مستفید نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اس طرز پر ہے کہ جیسے مفولات ہوا کرتی ہے۔ دوم میں نے سنا تھا کہ مہذب ملکوں کا دستور ہے کہ بچوں خرد ساں میں جو حکایتیں سناتے ہیں وہ اپنے ہی ملکوں کی شاہانہ تاریخ ہوتی ہے۔ جس سے ان کی اولاد کو بہت پہنچنا ہے۔ ایک خالص دنیا

کے ہیر پھیر کو خرد سالی ہی میں سلجھ جاتے ہیں نیز ان کو خاص کر اپنے ملک کے حال، متعلقہ سلطنت عمدہ طور سے واضح رہتے ہیں۔ بڑے ہو کر وہ سیاست داں بننے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ سوان باتوں کے لحاظ سے مین نے سوچا کہ مسلمانوں کے حق میں اس سے بہتر کچھ نہ ہوگا کہ نبی ﷺ کے حالات طیبہ مختصر بضد حکایت لکھے جائیں تا کہ مسلمانوں کے خرد سال بچے معمول حکایات سننے کے بجائے اچھی باتیں پڑھی اور ان سے اچھا نتیجہ نکال سکیں۔

سیرت النبی (پیارے نبی ﷺ کے پیارے حالات)

فیروز الدین ڈسکوس نے یہ کتاب ۱۹۰۵ میں تحریر کی ہے یہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں تذکرہ نگاری، سیرت نگاری اور تاریخ سے مدد لی گئی ہے۔ اختصار و اجمال کو حدود درجہ ملحوظ رکھا گیا ہے تمام تاریخی واقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ہمارے نبی ﷺ ۱۹۱۰ء میں جسٹس طیب جی کی فرمائش پر سید نواب علی نے بچون کے لیے سیرت رسول پر ہمارے نبی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ریاست بھوپال نے سرکاری طور پر طبع کرائی۔ جامع ملیہ کی جب دہلی میں بنیاد ڈالی گئی تو اس کتاب کو محمد علی جوہر نے شائع کروا کر نصاب میں شامل کیا۔ اور ادب کی یہ کتاب ترمیم واضافہ کے بعد کراچی کے مدارس میں شامل نصاب کردی گئی۔

نشر الطیب

نشر الطیب فی زکر حبیت۔ یہ کتاب مولانا اشرف علی تھانوی نے تحریر کی ہے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اکتالیس حصوں میں اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی زبان بڑی سادہ اور سلیس ہے۔ اس میں ہلکے پھلکے عام فہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تا کہ عام خاص، بوڑھا بچہ اس کو پڑھ کر نبی ﷺ کی سیرت کے چیدہ چیدہ واقعات سے آگاہ ہو سکے۔

آمنہ کا لال

علامہ راشد الخیری نے ۱۹۳۳ء میں یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ مولود نامہ ہے اس میں نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ کو منظوم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ مسلمان بچوں کے واسطے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو رطب و یابس سے پاک ہو اور نہ صرف ان کو مطمئن کر سکے۔ بلکہ وہ اپنی مجلسوں غیر مسلموں کے سامنے بھی اپنے رسول ﷺ کو پیش کر سکیں۔

☆

ماضی کے دریچوں سے

ظفر علی خاں

ز۔خ۔ش علی گڑھ

''تہذیب'' کے صفحات متعدد مشاہیر مثلاً مسٹر محمد لی لارڈ سنہا گاندھی۔ غازی انور پاشا، کے حالات و خیالات سے مزین ہو چکے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم اس بطل حریت کی بعض قربانیوں سے بہنوں کو روشناس کریں جس کی طویل المعیاد کو جدائی نے ہندوستان کو ماتم کدہ بنا دیا ہے۔ میری مراد مولانا ظفر علی خاں بی اے (علیگ) مالک روزنامہ ''زمیندار'' سے ہے مولانا نے تمام وقائع حیات سے صرف چند موٹی موٹی باتیں ہدیہ ناظرات کی جاتی ہیں کیوں کہ اس سبق آموز تفصیل کا بار ہمارے ننھے منے اغیار سے بآسانی نہیں اٹھ سکتا۔

مولانا ظفر علی خاں مولوی سراج الدین احمد مرحوم سابق ایڈیٹر ''زمیندار'' کے صاحب زادے ہیں۔ آپ کی دماغی پرورش گاہ ہونے کا فخر اسی غریب محمڈن کالج کو ہے جو آج مقطعی مصائب کا آماجگا بنا ہوا ہے۔

کالج سے نکلنے کے کچھ عرصہ بعد آپ نے ملازمت کے سلسلہ میں سلطنت آصفیہ کا دفع کیا جہاں آپ نے فرائض سرکار کے ساتھ ساتھ ان ذمہ داریوں کو بھی ادا کیا جو ایک روشن دماغ پر قدرت کی جانب سے عائد ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب آپ افسوس ناک اتفاقات کا شکار ہو کر ۱۹۰۹ء میں دکن سے خارج البلد ہوئے تو علمی دنیا نے ایک مشہور مترجم ایک کامیاب اڈیٹر ایک اعلیٰ ڈرامانویس اور ایک شیریں کلام شاعر کی حیثیت سے آپ کا استقبال کیا۔ آپ کی دو کتابوں کے علاوہ (جن کے صلہ میں نظام گورنمنٹ اور پنجاب یونیورسٹی نے تین ہزار اور پانچ سو روپے کے انعامات عطا فرمائے) ہماری نظر سے تمام تصنیفات گزر چکی ہیں اور ہم نے ہر تحریر کے مطالعہ پر بے اختیار ان کے تبحر علمی اور دماغی قابلیت کی دل ہی دل میں داد دی ہے۔

شاعری میں آپ کو مشہور آفاق جادو بیان نواب مرزا خاں داغ سے فیض تلمذ حاصل ہے۔ اگر چہ آپ کو اکبر و اقبال کے پہلو میں نہیں بٹھایا جا سکتا، تاہم آپ کی جادو نگاری میں کچھ شک نہیں۔ ۱۹۱۱ء وہ سال ہے جس نے دفعتاً آپ کے پایہ شہرت و وقعت کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا۔ طرابلس پر اطالیہ کا غاصبانہ حملہ ایک زبردست آسمانی تازیانہ تھا جس نے عالم اسلام کو صدیوں کی گہری نیند سے چونکا دیا۔ مسلمان ہند کی حیات ملی اس زمانے میں بڑی بڑی خراٹے لے رہی تھی اور سات کروڑ نفوس میں سیاسی حس کا پتہ ڈھونڈے نہ ملتا تھا یہ ظفر علی خاں اور انکے چند ساتھیوں ہی کا جگر تھا کہ حکومت اور خود قوم کی بے شمار مخالفتوں کے باوجود امر الٰہی سے مراد جسم میں روح پھونک دی اور خلافت، اخوت، حریت، اتحاد ملکی کے اہم مسائل پر اتفاق رائے حاصل کرلیا اس سلسلہ میں آپ نے

انگلستان سے یورپین ترکی کا سفر اختیار کیا اور اعلیٰ حضرت خلفیۃ المسلمین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

حریت کے مقصد عظیم کے حصول میں کئی محترم ہستیوں کے ساتھ مولانا ممدوح کو بھی ہدف مشکلات ہونا پڑا۔ پہلے ''زمیندار'' کی دو ہزار ضمانت ضبط ہوئی۔ پھر دس ہزار کی۔ پھر مطبع ضبط ہوا۔ پھر زمانہ جنگ میں آپ کئی سال نظر بند رہے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب دوسرے رہنمایان قوم کے ساتھ آپ کی زبان وعلم کو بھی آزادی نصیب ہوئی تو آپ پھر اگلی سی گرم جوشی سے خدمات خلافت انجام دینے لگے اور اسی کے ساتھ حکومت کی دراز ہستیاں بھی اپنا زور دکھانے لگین۔ ''زمیندار'' سے پھر دو ہزار کی ضمانت طلب ہوئی۔ سرحدی گورنمنٹ نے ان کو ممنوع الداخلہ قرار دیا۔ دولت آصفیہ نے بھی ان کا اور ان کے صاحب زادے کا وظیفہ بقدر ۸-۹ سو ماہوار بند کرلیا، بلکہ وہ دیرینہ وظیفہ بھی جو سابق فرماں رواں نور اللہ مرقدہ کے زمانے سے بقدر ایک سو پچیس ماہوار کے مولانا کو ملتا تھا سلب فرمالیا گیا۔

ستمبر سن رواں میں جب اپ ایک اہم قومی کام پر گوہ مری جارہے تھے اسٹیشن لاہور پر گرفتار کرلیے گئے۔ حوالات میں آپ نے سخت تکلیف اٹھائی اور...... مقدمہ میں تاخیر بھی بہت زیادہ روارکھی گئی۔ اس کے بعد حال میں مسٹر میک مچل کی قوت فیصلہ نے جو سزا تجویز کی، وہ بھی کچھ کم بصیرت افروز نہیں۔ باوجودیک آپ کا مقدمہ تمام مجرمین خلافت سے زیادہ صاف تھا ور گواہوں کے بیانات، وکیل سرکاری کی تقریر اور خود مولانا کا وہ بیان جس پر مولانا شوکت علی کے الفاظ میں ہر فرزند توحید کو ناز کرنا چاہئے متفقہ طور پر نرم سزا کی توقع دلا رہے تھے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قوت واہمہ غلط کاری تھی۔ ورنہ مولانا حاکم عدالت کی نظروں میں ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور اعلیٰ الاتصال دوسال قید سخت اور ۵ سال قید...... دریائے شور کے مستحق تھے۔

دوران مقدمہ میں مولانا نے اسلامی کوہ قاری کا نہایت قابل تعریف ثبوت دیا اور بے شمار صدیوں کے بعد حضرت یوسف کے تعرد رب السجن احب الی ممایدعوشی الیہ'' کو زندگہ کردیا۔ اگر مولانا سے اپنی قومی زندگی کے دوران میں ایک آدھ خفیفہ غلطی سرزد ہوگئی ہوگی تو ان کی زبردست وبے بدل قربانیوں میں سے صرف ایک قربانی اس کا نعم البدل قرار دی جاسکتی ہے۔ ان الحساب یدمن السیات'' محقق شیراز فرماتے ہیں اگر ہزار اشعار میں صرف ایک شعر قابل پسند ہو تو تجھے اپنی مردانگی کی قسم ہے کہ ان ہزار اشعار پر نکتہ چینی کا خیال دل میں نہ لا۔

اب میں اس مضمون کے خاتمہ سے قبل ظفر الملک والملت مولوی ظفر علی خاں کی عارضی جدائی پر ان کی بیگم صاحبہ اور کل اعزہ سے اظہار ہمدردی کرتی ہوں۔ مگر انھیں خوش ہونا چاہئے کہ مولانا سور یوسلیہ'' کے احیاے سے ایک قابل رشک عزت پر سرفراز کیے گئے ہیں۔

یہ منصب جلیل مل اجس کو نل چکا
ہر مدعی کے وسطے دار و رسن کہاں

اردو کی ایک گمنام شاعرہ

از جناب ممتاز علی خاں سہاوری

تہذیبی بہنیں محترمہ ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون نزہت شروانیہ مرحومہ دختر جناب نواب مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم) کو نہ بھولی ہوں گی، آپ ہندوستان کی ایک بہت بڑی شاعرہ اور تہذیب کی ایک سرگرم معاون تھیں۔ افسوس کہ انہیں اپنی قابلیت پوری طرح دکھانے کی مہلت نہ ملی اور موت نے انہیں عین عنفوان شباب میں آ کر ہم سے چھین لیا۔ ہمیں موت سے گلہ نہیں۔ ہمیں شکایت ہے تو اہل ذوق سے کہ انہوں نے مرحومہ کے شایان شان قدر نہ کی۔

جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میرے خاندان یعنی خاندان شروانیہ نے ایک ایسی ہستی کو جنم دیا۔ جس کا نام ہمیشہ شہرت کے آسمان پر ستان بن کر چمکتا رہے گا۔ تو میرا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ملک تو ملک خاندان نے بھی مرحومہ کی قدر نہ کی اور ایسی قابل قدر ہستی اپنی زنگی میں اور انتقال کے بعد بیس سال تک گمنامی کا شکار رہی اور دنیا اس کے نامی گرامی نام سے کماحقہ روشناس نہ ہو سکی۔ تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

صد شکر کہ مرحومہ کی مساعی جمیلہ رائیگاں نہ گئیں اور آخر دار الاشاعت پنجاب لاہور نے "فردوس تخیل" چھاپ کر صرف ہمارے خاندان پر ہی نہیں بلکہ دنیائے ادب اور اردو شاعری پر بھی احسان کیا۔ اگر مرحومہ کا کلام نہ چھپتا تو یقیناً دلدادگان شاعری ایک ایسی شاعرہ کے افکار عالیہ سے محروم رہتے۔ جس کے دل میں درد ہے۔ اور الفاظ میں تاثیر

جس طرح جھیل کے پانی میں کنول کا لطیف پھول۔ کھاد اور مٹی میں گلاب اور لالہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ناساز گار اور حوصلہ شکن ماحول میں بڑا دماغ جنم لیتے ہیں۔ مروحمہ نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ اور پروان چڑھیں جس میں تعلیم نسواں کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم کو عورتوں کے لیے معیوب اور گمراہ کن تصور کیا جاتا تھا۔ اور ان کو گھر کی چہار دیواری میں اس طرح مقید رکھا جاتا تھا کہ بیرونی فضا سے ان کا کوئی تعلم نہ رہے۔ قدرت کی مساعی کی داد دینا پڑتی ہے۔ کہ اس نے ایسے ماحول میں ایسی شاعرہ پیدا کی جس کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا۔ "زاہدہ خاتون شروانیہ جب میری عمر کو پہنچیں گی تو ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں ہوگا" لیکن افسوس کہ عمر نے دفا نہ کیا اور علامہ مرحوم کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ موت نے مرحومہ کا چراغ ہستی وقت سے بہت قبل سمجھا دیا۔ اور انہوں نے عین عالم شباب یعنی ۲۸ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں بھی انہوں نے وہ سب کچھ کہدیا جسے لوگ ایک طویل معد میں بھی نہیں کہنے پاتے۔ اور شاعری میں وہ مرتبہ پایا جو بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہے۔

نزہت کے پہلو میں ایک ایسا پر درد دل تھا جو صرف خود ہی نہیں تڑپا۔ بلکہ اوروں کے دلوں کو بھی تڑپاتا رہا

نزہت نے صرف خود ہی آنسو نہیں بہائے۔ بلکہ بہتیری اور آنکھوں سے بھی اشک باری کرائی۔ ایسے بندگان خدا بہت کم ہوئے ہیں جو خود بھی روئیں۔ اور دوسروں کو بھی رلائیں۔ جس آگ میں خود جل رہے ہوں اس کی چنگاریوں سے دوسروں کو خرمنہائے ہستی کو بھی جلا کر خاکستر کر دیں۔

اگر ان کی تصنیفات ''آئینہ حرم'' اور ''فردوس تخیل'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرحومہ کے دل میں اپنی قوم کی محبت کا سمندر موجزن تھا۔ اور اس قومی محبت کے درد نے ان کا عیش و آرام راتوں کی نیندیں غرض کہ سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ معمولی معمولی واقعات سے بہت متاثر ہو جاتیں شعر کہنے سے ان کا مقصد صرف شعر کہنا ہی نہیں بلکہ قوم اور ملک کی خدمت کرنا بھی ہوتا تھا ''بصائر سیاسیہ'' معارف ملیہ اور ''انور پاشا'' کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ جو کچھ ان کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ اس میں کس حد تک صداقت ہے جب کوئی حساس اور درد مند مسلمان ان نظموں کو پڑھتا ہے تو فرط غم سے اس کا دل پاش پاش ہو جاتا ہے اور وہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر اشک افشانی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہی شاعر کی معراج ہے یعنی جس چیز کو وہ جس انداز میں پیش کرے۔ اسی انداز سے لوگ اسے خوش آمدید کہیں گے۔ اگر وہ کوئی انبساطیہ یا نشاطیہ چیز پیش کرے۔ تو لوگوں کے دل میں مسرت و شادمانی کی لہریں دوڑ جائیں۔ اور اگر وہی شاعر کوئی چیز حزنیہ یا المیہ پیش کرے۔ تو وہ مغموم ہو جائیں۔

مد اور تاثیر کے ساتھ ساتھ نزہت کے یہاں خیالات کی بلند پروازی۔ دل کشی۔ سلاست اور رومانی بھی موجود ہے۔ ''مسدس'' ''ائینہ حرم'' ایک دریا ہے جو بلا روک ٹوک بہے چلا جا رہا ہے نظم ''اے باپ'' عہد طفلی کی ایک بہترین تصویر ہے۔ اور بچپن کے تاثرات کو نہایت ہی اچھے اسلوب میں بیان کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آہ میں ہر گز نہ بھولوں گی وہ ایام طرب
جب مجھے حاصل تھا ''بچہ'' کا محبت زا لقب''
جب مجھے آتے تھے دنیا کے یہی دو چار کام
کھیلنا، کھانا پہننا، شادماں رہنا مدام
تھا یہ حال علم گر سیدھی لکیر اک دیکھ لی
ہو کے خوش ''آہا'' الف - الف'' چلا اٹھی''
آہ میرا عہد فلی۔ توبہ عہد سلطنت
کس قدر شک آفریں تھا۔ کس قدر پر تمکنت

اور نظم ''ہمارے بعد'' میں تو مرحومہ نے غضب ہی کر دیا ہے۔ اس دار المحن کا نقشہ ایسے انداز میں کھینچا ہے کہ دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چنے ہوئے الفاظ۔ تاثیر، درد اور کرب میں بجھانے

کے بعد سپرد قرطاس کیے گئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد ایام کہ ہم پیکرا بے جاں ہوں گے
تارک خانہ و مہجور عزیزاں ہوں گے
کام آئے گی نہ کچھ آپ کی دانشمندی
لقمہ کرم لحد حضرت انسان ہوں گے
رخ زیبائے حقیقت سے نقاب اٹھا گا
جتنے اسرار ہیں پردے میں نمایان ہوں گے
واہ کیا کیفت آمیز زمانہ ہوگا
جب کہ ہم بے خبر شورش دوراں ہوں گے
غم پامالی حسرت سے نہ دل خوں ہوگا
نہ یہ امیدیں رہیں گی۔ نہ یہ ارماں ہوں گے
شاخ پر بیٹھ کے مرغان خوش الحان چمن
صورت نزہت مرحومہ غزل ہوں گے
گائیں گے ہوکے ہم آواز ہمارے اشعار
اور ہم ساکن اقلیم خموشاں ہوں گے

غرض نزہت کا کلام ایک بحر ذخار ہے۔ جس کی تہہ میں درد، تاثیر سلاست روانی اور فصاحت و بلاغت کے گہر ہائے کمیات بکھرے ہوئے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سمندر میں غوطہ لگائے اور ان انمول موتیوں کو چن لائے اور ان سے بہرہ اندوز ہو۔

آخر میں اتنا کہوں گا کہ مبارک اور قابل قدر ہے وہ وقت وہ ملک اور وہ خاندان جو نزہت جیسی شخصیت پیدا کرتے اور خوش بخت ہیں وہ والدین جن کے گھر میں مرحومہ جیسی ہستی تولد ہو۔ اللہ تبارک تعالی سے میری دعا ہے کہ جنت میں مرحومہ کو اعلیٰ مراتب عطا فرمائے اور ان کے کلام کو دائم رہنے والی شہرت نصیب کرے۔

☆

تبصرہ

نام کتاب: مشاہیر کے خطوط ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن کے نام

ترتیب وتقدیم: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن

ضخامت: ۲۰۸ قیمت: ۲۵۰

اشاعت اول: ۲۰۱۸ء

ناشر: مرکز تحقیقات اسلامی، گلشن عتیق، نیو عظیم آباد کالونی، صندل پور، پٹنہ۔۶

مبصر: ب ع ر

اس مجموعہ میں ایک سو خطوط ہیں؛ اور مولف کے لکھنے کے مطابق "بیشتر حضرات اس وقت مرحومین ہو چکے ہیں"۔ چند خطوط کے عکس بھی کتاب میں شامل ہیں، مکاتیب نقل کرنے سے پہلے ہر مکتوب نگار کا مختصر تعارف بھی دے دیا ہے۔

یہ مکتوبات تین حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ "بزرگان علم و ادب"، جن میں عبدالماجد دریادی سے لے کر شفیع مشہدی تک مندرجہ ذیل مشاہیر شامل ہیں:

عبدالماجد دریابادی (ان کے اپنے یا ان کی طرف سے لکھے گئے ۲۵ خط اس مجموعہ میں شامل ہیں، دوسرے مکتوب نگاروں میں شاہ معین الدین احمد ندوی، سعید احمد اکبرآبادی، ابوالعرفان ندوی، عبدالسلام قدوائی، شورش کاشمیری، وحیدالدین خاں، امتیاز علی خاں عرشی، حبیب الرحمٰن اعظمی، ابوالحسن علی ندوی، ضیاء الدین اصلاحی، علیم الدین قدوائی، کلیم سہسوانی، نظیر صدیقی، ظفیر الحق، سالم قدوائی، شفیع مشہدی، ایوب اعظمی، سعید الرحمٰن اعظمی، مختارالدین احمد، حامد علی خاں (علی گڑھ) رابع حسنی ندوی، شمس تبریز خاں، احسن الظفر، محمد اجمل اصلاحی، ضیاء الحسن ندوی، محسن عثمانی ندوی، شفیق احمد خاں ندوی، کفیل احمد قاسمی، "سید محمد رضاء اللہ انصاری" (علی گڑھ)، انیس چشتی، قیوم خضر، ش م عارف ماہر آروی صاحبان۔

دوسرے حصہ میں پانچ ''اساتذہ کرام'' شامل ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

ایوب اعظمی، سعید الرحمٰن اعظمی، مختار الدین احمد، حامد علی خاں (علی گڑھ) رابع حسنی ندوی

تیسرے حصہ میں ''محبان گرامی'' شامل ہیں، جن میں مندرجہ ذیل اگیارہ نام ہیں:

شمس تبریز خاں، احسن الظفر، محمد اجمل اصلاحی، ضیاء الحسن ندوی، محسن عثمانی ندوی، شفیق احمد خاں ندوی، کفیل احمد قاسمی، ''سید محمد رضاء اللہ انصاری'' (علی گڑھ)، انیس چشتی، قیوم خضر، ش م عارف ماہر آروی صاحبان۔

ان سب ناموں کی ابجدی ترتیب کردی جائے تو ایسے پڑھیں:

ابوالحسن علی ندوی، ابوالعرفان ندوی، احسن الظفر، امتیاز علی خاں عرشی، انیس چشتی، ایوب اعظمی، حامد علی خاں (علی گڑھ) حبیب الرحمٰن اعظمی، رابع حسنی ندوی، شمس تبریز خاں، سالم قدوائی، سعید احمد اکبرآبادی، سعید الرحمٰن اعظمی، سید محمد رضاء اللہ انصاری'' (علی گڑھ)، ش م عارف ماہر آروی، شاہ معین الدین احمد ندوی، شفیع مشہدی، شفیق احمد خاں ندوی، شورش کاشمیری، ضیاء الحسن ندوی، ضیاء الدین اصلاحی، ظفیر الحق، عبدالسلام قدوائی، عبدالماجد دریابادی، علیم الدین قدوائی، قیوم خضر، کفیل احمد قاسمی، کلیم سہوانی، نذیر صدیقی، محسن عثمانی ندوی، محمد اجمل اصلاحی، مختار الدین احمد، وحید الدین خاں صاحبان۔

''محبان گرامی'' میں ایک دلچسپ نام نظر آیا، سید ''یعنی سید محمد رضاء اللہ انصاری''، یہ ''سید صاحب'' انگریزی میں نام کے شروع میں SM لکھتے ہیں اور نام کے آخر میں انصاری۔ بعض دوسروں کی طرح عتیق صاحب نے بھی انھیں ان کے .S.M کو سید محمد ترجمہ کردیا (ویسے سید ظل الرحمٰن کے دوست کو سید کا سابقہ لگانے کا حق حاصل ہے)۔

(ایک نام اور بھی دلچسپ ہے، یعنی انیس چشتی، پونہ (مہاراشٹر)۔ ''حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی جب بھی پونہ جاتے تو انھیں کے یہاں ان کا قیام رہتا تھا...... میں جب ۱۹۹۸ء میں پونہ گیا تو انھیں کے گھر پر مولانا سے مرید ہونے والوں کی بھیڑ دیکھی، میں بھی وہیں مرید ہوا۔ جس کے بعد جناب انیس چشتی نے فرمایا کہ آج سے ہم آپ پیر بھائی ہوگئے''۔

یہ انیس چشتی وہ تو نہیں ہوسکتے جو علی گڑھ کے اولڈ بوائز میں ہیں، اور مشہور کتاب ''صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین'' کے مصنف!

مؤلف کی 'خود نوشت سوانح عمری' کے لیے کارآمد مواد، جہاں جہاں مشاہیر سے ان کے تعلقات کی تفصیل ہے:

● ''پروفیسر شمس تبریز خاں میرے ہم عمر اور ہم سبق تھے۔ ہم دونوں میں دو ایک سال کا فرق تھا۔ ہم دونوں ایک ہی گاؤں نیا بھوجپور کے باشندہ تھے۔ ہم دونوں نے ایک ہی درسگاہ جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور میں کافیہ، علم الصیغہ تک تعلیم حاصل کی۔ پھر میں مفتاح العلوم مئوناتھ بھنجن چلا گیا اور شمس تبریز صاحب دیوبند چلے گئے۔ دو

تین سال بعد جب میں دیوبند پہنچا تو ہم دونوں ہم سبق ہوگئے۔ اور دونوں نے ۱۹۶۵ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد شمس تبریز صاحب گونڈہ کے کسی مدرسہ میں مدرس ہوگئے۔ پھر ندوہ آکر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے رفیق ہوگئے۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی شعبہ کے صدر ہوئے۔ یہاں تک کہ ملازمت کے دوران ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ۱۹/ جنوری ۲۰۱۳ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان للہ وانا الیہ راجعون"۔ (ص ۱۵۷)۔ ● "پروفیسر احسن الظفر نے مجھ سے دو سال قبل دیوبند سے فراغت حاصل کی"۔ (ص ۱۷۴) ● "میں بی اے کرنے کے بعد علی گڑھ چلا گیا" (ص ۱۸۰)۔ ● "پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی سے میرے تعلقات ۱۹۶۵ء سے شروع ہوئے، جب میں تخصص فی الادب العربی کا ندوہ میں طالب علم تھا...... میں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کیا اور پھر ایم اے کے لئے علی گڑھ پہنچا...... فراغت ک بعد ہم دونوں پھر بکھر گئے میں خدابخش لائبریری چلا آیا، جہاں تیس سال ملازمت میں رہا" (ص ۱۸۷)۔ ● "پروفیسر کفیل احمد قاسمی سے میرے تعلقات دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی یعنی ۱۹۶۵ء سے تھے وہ مجھ سے ایک سال بعد فارغ ہوئے، فراغت کے بعد میں لکھنؤ چلا گیا......" (ص ۱۹۱)۔ ● "میں جب ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ پہنچا تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی مسلم یونیورسٹی کے دینیات فیکلٹی کے ڈین تھے، اکثر اوقات ان کی خدمت میں حاضر ہوتا...... یہ سلسلہ ۱۹۷۲ء تک قائم رہا، جب تک میں وہاں زیر تعلیم تھا" (۶۸)۔ ● "مولانا عبدالسلام قدوائی سے میرا تعلق اس وقت قائم ہوا جب میں نے ندوہ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں داخلہ کے سلسلہ میں، میں ان سے رابطہ قائم کیا" (ص ۸۱)۔ ● "میں نے شورش کشمیری کو ۱۹۶۵ء میں اس وقت سے جانا جب ان کا اخبار چٹان دارالعلوم دیوبند کے دارالمطالعہ میں پڑھنا شروع کیا" (ص ۸۴)۔ ● "مولانا وحیدالدین خاں سے میرے تعلقات اس وقت شروع ہوئے، جب میں ۱۹۶۵ء میں دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ پہنچا، ان دنوں مولانا مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے منسلک تھے، جو دارالعلوم کے احاطہ میں واقع تھا...... مولانا عصر بعد تفریح کرنے ندوے سے باہر جاتے، برٹش لائبریری سے انگریزی کتابیں لانے جاتے تو مجھے بھی ساتھ کر لیتے۔ مجھ پر مولانا کا احسان ہے کہ انھیں کی تحریک پر میں جدید علوم کے اصول کی طرف متوجہ ہوا" (ص ۸۷-۸۸)۔ ● "میں نے مولانا عرشی سے شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کے بارے میں سوال کیا تھا۔ جواب میں منجملہ اور باتوں کے انھوں نے یہ بھی لکھا کہ "یہ لطف کی بات ہے کہ شاہ عبدالقادر نے اپنے والد مرحوم کے فارسی ترجمہ کا دیباچہ میں ذکر کیا ہے، مگر بھائی کے ترجمہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا" (ص ۹۵، ۹۷)۔ ● "میں نے مفتاح العلوم، مئوناتھ بھنجن کے دورہ طالب علمی (۱۹۶۰-۱۹۶۲ء) میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر علمی وادبی استفادہ کیا تھا"۔ ● "۱۹۶۵ء میں جب دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر لکھنؤ آگیا تو نہایت قریب

سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کو دیکھنے اور مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا، کیوں کہ مولانا ان دنوں ندوہ کے ناظم تھے، کئی سال بعد جب میں ایک صحیح مرشد کی تلاش میں تھا تو دوسرے اہل اللہ کے بجائے انھیں کی ذات گرامی پر میری نظر انتخاب پڑی'' (ص ۱۰۴)۔ ● ''مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی وفات یکم فروری ۲۰۰۸ء کو ہوئی اور دار المصنفین کے احاطہ میں مدفون ہوئے، مولانا جب بھی خدا بخش لائبریری کے سیمینار میں شرکت کرنے کی غرض سے آئے ان سے میری ملاقات رہی'' (ص ۱۱۰)۔ ● ''اگست ۱۹۷۰ء میں نے جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی میں ایم اے میں داخلہ لیا تو پروفیسر مختار الدین احمد سے ایک شاگرد اور استاد کی حیثیت سے میری ان کی دید وشنید ہوئی، میں ۱۹۷۳ء میں وہاں سے ایم اے کرکے چلا آیا تب بھی میرے ان سے تعلقات باقی رہے'' (ص ۱۳۷-۱۳۸)۔ ● ''پروفیسر حامد علی خاں رامپور کے باشندہ تھے، میں جب ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ گئے تو وہ میرے بھی استاد ہوئے۔ میں نے دو سال تک ان سے ادبیات عربی ہند کی تعلیم حاصل کی۔ ۷ نومبر ۱۹۹۸ء میں وفات پائی'' (ص ۱۴۴)۔ ● ''مولانا سید رابع حسنی ندوی سے میرے تعلقات ۱۹۶۵ء سے شروع ہوئے، مولانا نے تخصص فی الادب العرب کے شعبہ میں مجھے تاریخ ادب عربی پڑھایا...... مولانا کی ہدایت پر میں نے رابطۂ ادب اسلامی عالمی کی بہار شاخ ۲۰۰۸ء قائم کی'' (۱۴۷)۔ ● ''آج سے تیس سال قبل جب میں نے ایک عربی مقالہ نشأت علم الحدیث فی ولایۃ بہار ثقافۃ الہند دہلی میں چھپنے کے لئے بھیجا تو مولانا اجمل اصلاحی اس کے نائب مدیر تھے'' اور میرے دو مقالے اس پرچے میں چھپے، پہلا مقالہ ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا'' (ص ۱۷۷)۔

● ''پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی سے میرے تعلقات ۱۹۶۷ء سے قائم ہوئے، جب ہم دونوں لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، میں دبیر ماہر کر رہا تھا جبکہ وہ ایم اے عربی کے طالب علم تھے۔ وہ ہم سے چار پانچ سال سینئر تھے، ایم اے کرکے جامعہ ملیہ میں لکچرر ہوکر چلے گئے، میں بی اے کرنے کے بعد علی گڑھ چلا گیا'' (ص ۱۸۰)۔

● ''پروفیسر سید محمد رضاء اللہ انصاری، سائنس کے نامور پروفیسر ہیں، وہ کئی بار خدا بخش لائبریری آئے، اور نجوم و فلکیات کے اہم مخطوطات ان کے زیر مطالعہ رہے۔ یہی مخطوطات میرے ان کے تعلقات ذریعہ بنی، خاص زیج محمد شاہی کے بعض مقامات کے حل کرنے میں میں نے ان کی مدد طلب کی'' (ص ۱۹۵)۔

ان خطوط میں سب سے قیمتی حصہ عبد الماجد دریابادی صاحب کے خطوط ہیں، ملاحظہ ہو:

۱۳/ اگست ۱۹۶۳ء : جو مسئلہ کتاب وسنت میں مجمل بیان ہوا ہو اس کا اجمال قطعی صورت میں کوئی کیسے رفع کردے؟ تعبیر وتشریح میں تو اختلاف ہمیشہ باقی رہے گا اور ہر فریق اپنی فہم وبصیرت کے مطابق صرف دلائل ہی پیش کرے گا۔ تعیین شخصیت ذوالقرنین بھی اسی قسم کے مسائل میں سے ہے۔

۲۔میں نے کسی اور کتاب کو نہیں صرف ایک فلسفۂ اجتماع کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج کیا ہے، اس میں متعدد باتیں ضلالت صریح کی آگئی ہیں۔

۳۔اس کا جواب مشکل ہے، اپنے لئے نمبر اول پر سرمایہ سعادت اپنی تفسیر اردو (طبع ثانی ہنوز غیر مطبوع) کو سمجھتا ہوں، پھر انگریزی تفسیر کو پھر سیرۃ نبوی قرآنی اور بشریت انبیاء اور شرح مناجات مقبول اور سفر حجاز کو،ایک دوسرے معیار سے محمد علی ذاتی ڈائری اور حکیم الامت کو ایک اور معیار سے نشری تقریروں کو۔

ستمبر ۱۹۶۴ء کے ایک خط سوال کیا گیا تھا: ''ابن تیمیہ کا مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہے۔لیکن دلیل وہ قرآن پاک کی آیت الرحمٰن علی العرش سے پیش کرتے ہیں جو ظاہری معنی کے لحاظ سے صحیح ہے۔جبکہ علمائے متکلمین اسلام ان کی تاویل کرتے ہیں اور اس کا عام معنی مراد لیتے ہیں۔میرے خیال میں ابن تیمیہ کا مسلک زیادہ بہتر ہے۔جیسے بادشاہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک جگہ پر رہتا ہے لیکن اس کے کارندے ملک میں پھیلے ہوتے ہیں اور تمام معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔اسی طرح اللہ کو عرش پر متمکن تسلیم کیا جائے اور اس کے فرشتے تمام نظام کائنات کو اس کے حکم سے چلا رہے ہیں۔اس میں کیا قباحت ہے۔بلا وجہ تاویل کا راستہ کیوں اختیار کیا جائے''۔مولانا دریابادی صاحب نے جواب دیا:

کھلا ہوا قیاس مع الفارق! بادشاہ بے چارہ تو محدود جسم والا، محدود قوت والا ہے، اس کے لیے ہر جگہ ہر آن موجود ہونا کیوں کر ہو۔

عرش پر کوئی تجلی خصوصی ہوگی۔یہ ''کیا ضرورت تھی'' کا سوال بڑا خطرناک ہے، عرش پر متمکن ہونے میں کیا ضرورت معراج کرانے کی کیا ضرورت تھی، دنیا بنانے ہی کی کیا ضرورت تھی وغیرہ۔

کیا بلا واسطۂ جبریل وحی نہیں آسکتی تھی، فرشتہ کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ ہر بندے سے براہ راست مخاطبت نہیں کرسکتا، بعثت انبیاء کی کیا ضرورت تھی۔

ابن تیمیہ بڑے شخص تھے اور ماضی میں جتنے بھی امام گزرے ہیں، باطل ہر کسی کو نہیں کہا جاسکتا، دلائل سب ہی کے پاس ہیں، سوال صرف توجیح کا رہ جاتا ہے اور قابل ترجیح مسلک متکلمین کا ہے۔

۱۳/ جنوری ۱۹۶۴ء : ظاہر ہے کہ عربی میں نسلا بعد نسل ہی صحیح ہے۔لیکن فصحائے اردو اگر نسلا بعد نسلا کہنا اور لکھنا شروع کردیں تو اردو میں وہی صحیح بلکہ فصیح مان لیا جائے گا، ہر زبان میں مستند عرف اسی کے فصحاء کا قول و عمل ہوگا۔نہ کہ اس زبان کا جس سے کوئی لفظ آیا ہے۔

۲۔یقیناً میں نے مولانا شبلی سے کسب فیض کیا ہے۔اور اپنی بساط بھر پوری طرح کیا ہے۔ان کی کتابوں، مقالوں کو خوب پڑھا اور ان کے فقروں، ترکیبوں اور طرز انشا کی نقالی برسوں کی ہے۔

۲۴/ جنوری ۱۹۶۴ء : عداوت بحمد للہ کسی ادنی مسلمان سے نہیں چہ جائیکہ مولانا مرحوم و مغفور سے۔ علمی و ادبی مسائل میں اختلافات جو طلوع الہلال سے دو چار سال تک رہے۔ ۱۷ء میں بحمد للہ وہ بھی ختم ہو گئے۔ ۱۸ء میں مولانا نے جب وہ رانچی میں نظر بند تھے عذر معذرت ہی کر لی۔ اور ادھر سے بھی پورے انشراح خاطر کے ساتھ جواب آ گیا، یہ ساری خط و کتابت صدق میں بھی نکل چکی ہے اور لکھنؤ کے ماہنامہ نیا دور میں بھی۔ آخر تک تعلقات اچھے ہی رہے، ذاتی معاملات میں بحمد للہ سالہا سال سے خاموشی ہی رہنے کا ہے، جس کا جو جی چاہے لکھے اور اخبار مذکور تو برسوں سے لکھ رہا ہے، یوم الحساب کچھ ایسا دور تو نہیں۔

دینی حالت ندوہ کی جامعہ سے کہیں بہتر ہے۔ دوسری چیزوں کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

سفر دہلی کی کبھی کوئی مخصوص و متعین غرض نہ تھی، مختلف دواعی و محرکات تھے۔ اجمالی ذکر سیر دہلی میں آ گیا ہے۔

میری کسی کتاب کی فروخت و اشاعت کا تعلق مجھ سے نہیں، منیجر صدق ایجنسی لکھنؤ سے رہا ہے۔ خط تو جو بھی ہیں سب نجی ہیں۔ غیر نجی کوئی خط نہیں۔

کچھ اپنے حالات لکھ دیئے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ اشاعت بھی فوراً ہو جائے۔

غالباً ۲۵ء میں مولانا کی وفات پر جو مضمون لکھا تھا اس میں ضرور اسی کا ذکر ہوگا۔

۱۱/ مارچ ۱۹۶۵ء : مجھے بالکل یاد نہیں پڑ رہا ہے کہ میں نے مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور کے لیے یہ الفاظ کہیں کہے ہوں اور اس کا یقین بھی نہیں آ رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ میرے مسلک و عقیدہ کے خلاف ہے۔ میں تو ہر ادنی سے ادنی کا کلمہ گو کے حق میں دعائے رحمت و مغفرت کا عادی ہوں۔ چہ جائیکہ مولانا کی سی جلیل القدر اور باعث فخر شخصیت کے لیے (رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں یہی استعمال کیا ہے، (عتیق) لفظی لحاظ سے تو یہ بے شک صحیح ہے کہ بجز انبیائے کرام اور عشرہ مبشرہ کے اور کسی کی مغفوریت یقینی نہیں کہی جا سکتی ہے۔ لیکن بہر حال عملاً ہم ہر کلمہ گو کو بہ لحاظ حسن ظن و اغلبیت جنتی ہی لکھتے ہیں۔ چہ جائیکہ ان کو جو خدمت دین میں اتنے ممتاز ہوں، اگر کہیں میں نے وہ الفاظ کہے بھی ہوں تو واللہ اعلم کس سیاق میں اور کس سوال کے جواب میں اور اب مولانا کی روح سے معذرت کے ساتھ باتیں بصد ندامت و تاسف واپس لیتا ہوں اور آن عزیز کو اختیار دیتا ہوں کہ میری اس معذرت کو اس اخبار میں یا جہاں کہیں پسند ہو چھپوائیں۔ صدق میں بھی انشاء اللہ اس کی نقل شائع کر دی جائے گی۔

۱۵/ جون ۱۹۶۵ء : جو مسئلہ جس طرح اپنی سمجھ میں آتا ہے بیان کر دیتا ہوں اور اس خبط میں بحمد للہ کبھی نہیں پڑتا کہ اس کے موافق کتنے ہوں گے اور مخالف کتنے۔ اور نہ اپنے کسی مخلص سے اس پر خوش ہوتا ہوں کہ اس نے بجائے اپنی اصلاح حال کی فکر کے اس تحقیق میں پڑا ہے کہ فلاں ادارے میں مردم شماری میرے موافق کتنی ہے اور مخالفوں کی کتنی! دیو بند ہوا، علی گڑھ ہوا، ندوہ ہوا بالکل ظاہر ہے کہ سب کہیں موافق بھی بہت ہوں گے اور

مخالف بھی بہت سے۔

بحث ومناظرہ سے بات بگڑتی ہی جاتی ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات کی پچ آپڑتی ہے۔ قل کل یعمل علی شاکلتہ......

۱۔ میں قادیانیت سے نہیں احمدیہ سے واقف ہوں، جس طرح روافضہ سے نہیں، اشعریہ وامامیہ سے، دیانندیوں سے نہیں آریہ سماجیوں سے اور وہابیوں سے نہیں۔ اہل حدیث سے واقف ہوں، معمولی تہذیب و شائستگی کا تقاضا ہے کہ ہر فرقہ کا نام وہی لیا جائے جو خود اس نے اپنا رکھا ہے نہ کہ وہ جو اس کے مخالفوں نے اسے معطون کرنے کے لیے چلا دیا ہو۔

۲۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ تکفیر احمدیہ پر کہیں اجماع (بہ اصلاح شریعت) منعقد ہو چکا ہو، رہی علمائے عصر کی اکثریت اور غالب اکثریت، تو وہ وہی اکثریت ہے جو سرسید کے کافر ہونے پر، غیر مقلدین کے گمراہ ہونے پر اور شیعیت کے کافر ہونے پر اتفاق کر چکی ہے۔

۳۔ میں نے احمدیہ لٹریچر اچھا خاصا پڑھا ہے (اردو میں بھی انگریزی میں بھی) اتنا علما میں سے کم ہی کسی نے پڑھا ہوگا۔ اس میں بہت باتیں معقول و قابل قدر ہیں اور بہت سی قابل اعتراض ہیں۔ تکفیر کسی ایک عقیدے سے ہی لازم نہیں آتی، وہ ختم نبوت کے منکر ہرگز نہیں۔ البتہ اس کی تاویل ایسی کی ہے جو عقیدہ جمہور سے الگ ہے۔ یہ تاویل صحیح نہیں لیکن لغت میں گنجائش اس کی بھی موجود ہے، اس لیے بنائے تکفیر نہیں بن سکتی، ہاں مخالف جمہور، مخالف اہل سنت وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔

☆

تبصرہ

کتاب: قرآن کریم اور اللہ کے بندوں کو نفع رسانی

مصنف: ظفرالاسلام اصلاحی

ناشر: حلقۂ درس قرآن، اسلام منزل، اسٹریٹ نمبر۔۸، اقرأ کالونی، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

سن اشاعت: ۲۰۱۹ء

صفحات: ۴۸

اشاعت: برائے ہدیہ

مبصر: سراج کریم سلفی (اسکالر ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ)

بلاشبہ دینِ اسلام امن وامان اور انسانی اقدار کا علم بردار ہے، انسانوں کی رہنمائی کے لیے قرآن کریم کو نازل کرنے والی ذاتِ اعلیٰ واقدس کی خاص صفت رحمانیت ورحیمیت ہے۔ نبی آخرالزماں ﷺ، جن پر یہ کتابِ ہدایت نازل کی گئی، وہ سارے جہاں والوں کے لیے سراپا رحمت ہیں اور یہ کتابِ عظیم سب کے لیے وسیلۂ ہدایت و رحمت ہے۔ اس کے دامن میں رأفت ورحمت، شفقت ومودت، اخوت وبھائی چارگی کے ایسے پھول ہیں جن سے پوری دنیا معطر ہے۔ اس نے دنیا کو الفت ومحبت اور انسانیت کا درس دیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس کے متبعین بھی رحمت ورأفت کے پیکر ہوں، ہمدرد وغم گسار ہوں، خیر اور بھلائی کو عام کرنے والے ہوں۔ قرآن وسنت میں مختلف پیرایوں سے مسلمانوں کو انسانوں کے ساتھ محبت وہمدردی اور رحمت ورأفت کا معاملہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور انہیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، میل جول، سماجی معاملات غرض ہر عمل اور ہر قدم دوسروں کے لیے باعث رحمت وخیر ہو۔ ان کی کسی بات یا حرکت کسی کے لیے باعث اذیت نہ بنے۔ قرآن میں مختلف مقامات پر محسنین یعنی اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان کرنے والوں کی تحسین کی گئی ہے اور ان کے لیے اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں متعدد مظاہر رحمت کی نشان دہی کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ ان کو اپنا کر انسان اپنی

عاقبت سنوار سکتا ہے اور روز مرہ زندگی کو خوش گوار بنا سکتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب انہی مظاہر و مواقع کو آشکارا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس کے مصنف مشہور ماہر قرآنیات پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی ہیں۔ انہوں نے مذکورہ موضوع پر بڑے مؤثر انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

اس مختصر کتاب میں سب سے پہلے قرآن کریم کا انسانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہونا واضح کیا گیا ہے اور دلائل کے ساتھ اس نکتہ پر خاص زور دیا گیا ہے کہ یہ کتاب ہدایت، کتاب رحمت، کتاب موعظت، کتاب تذکیر اور کتاب خیر کثیر ہے۔ پھر متعدد ذیلی عناوین

۲

کے تحت یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے بندوں کو نفع پہچانا اہل ایمان کی شناخت ہے۔ مثلاً: اسلام دین رحمت ہے، نفع رسانی اہل اسلام کی

امتیازی خصوصیات میں سے ہے، نفع رسانی کی مختلف صورتیں ہیں، محتاجوں کی مالی اعانت نفع رسانی کا اہم ذریعہ ہے، اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے، دعائے خیر بھی نفع رسانی کا ذریعہ ہے، اعمال خیر کا دائرہ بہت وسیع ہے، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا اس کا شکر بجالانا ہے، نیکی کو فروغ دینا لوگوں کو نفع پہنچانا ہے، خیر کی طرف رہ نمائی بھی نفع رسانی ہے، دوسروں کو ایذا رسانی سے

محفوظ رکھنا کارِ خیر ہے، ذہنی اذیت سے لوگوں کو بچانا موجب اجر و ثواب ہے، جسمانی یا کسی بھی طرح کی تکلیف سے بندگانِ خدا کو محفوظ رکھنا نیکی ہے، غیر مسلموں کو ایذا رسانی سے محفوظ رکھنا بھی کارِ ثواب ہے۔

فاضل مصنف کی تحریر بڑی سلیس، عام فہم اور پُر اثر ہے۔ انہوں نے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے بھرپور استدلال کیا ہے۔ ان کی یہ وضاحت بہت اہم ہے کہ نفع رسانی کے یہ مواقع اور ایذا رسانی سے دور رہنے کا حکم مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ اسلام کی یہ تعلیمات تمام انسانوں کے لیے ہیں۔ اس نکتہ کی اہمیت اس پس منظر میں اور بڑھ جاتی ہے کہ موجودہ دور میں بہت سے لوگ اسلام اور اس کے ماننے والوں سے تشدد، ظلم اور خوں ریزی کو منسوب کرتے ہیں، اس صورت حال میں ہمیں علمی اور عملی دونوں اعتبار سے ثابت کرنا ہے کہ اسلام دین رحمت اور انسانیت پرور ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کی افادیت عام کرے اور اسے شرف قبولیت بخشے۔ آمین ثم آمین۔

مراسلہ

ڈاکٹر اصغر عباس

مدیر محترم ریاض صاحب کی تحریر میں جمشید مارکر کا ذکر خیر کی تصنیف کا طویل تذکرہ پڑھنے کے بعد معاً خسرو صاحب کی تحریر سامنے آگئی، جسے اقتباساً فکرِ نو کے قارئین کے سامنے از سرِ نو مارکر کے ذکر خیر کے ضمن میں پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا، ملاحظہ ہو:

"بہت نازک مضمون ہے جو پچاس سال سے اس ملک کو ستا رہا ہے Two Nation Theory اور Three Nation Theory تو اگر Conflict ہو جائے اگر تصادم ہو جائے ان وفاداریوں میں، تو کون سی وفاداری بالآخر مانی جائے گی، اس پر عام طور سے دنیا میں اتفاق ہے کہ ____ ملک سے وفاداری ایک مستحکم وفاداری ہے۔ اور اگر Conflict ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ تصادم ہو جائے۔ تصادم نہ ہونے دینے کی بیسیوں شکلیں پیدا کی جا سکتی ہیں کہ وفاداری میں تصادم نہ ہووے۔ لیکن اگر تصادم ہو گیا تو ایسی صورت میں ملک سے وفاداری لازمی ہے؛ اس میں مجھے آپ سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور سعودی عرب کے لوگ بھی مسلمان ہیں سارے کے سارے تقریباً، کیا سعودی لوگ مجھے نیشنلیٹی دیدیں گے؟ اس لیے کہ میں مسلمان ہوں؟ نہیں دیں گے۔ عام طور سے سعودی عربیہ میں پیدا ہونا ہی حق دے گا وہاں کی Nationality کا۔ کیا پاکستانیوں کو جو مسلمان ہیں ان کو سعودی اپنی Nationality دے دیں گے؟

میرے ایک دوست تھے مسٹر جمشید مارکر، اب بھی ہیں جو پاکستان کے سفیر ہیں United States میں، اور جب میں جرمنی میں سفیر تھا ہندستان کا، تو وہ پاکستان کے سفیر تھے جرمنی میں، اور میرے یہاں کے رہنے والے تھے، وہیں حیدر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ حیدر آباد دکن میں اور ان سے میرا یارانہ تھا۔ تو جمشید مارکر اس سے اتفاق کیا۔ جمشید مارکر پارسی ہیں مسلمان نہیں ہیں۔ پاکستان ان سے یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ اسلام سے وفاداری رکھیں گے کیوں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن پاکستان ان سے ضرور یہ خواہش رکھے گا، نہ صرف خواہش بلکہ لازمی طور سے ان سے یہ منوائے گا کہ پاکستان سے ان کی وفاداری ہو"۔

☆☆☆

مراسلہ

مہر کے سلسلہ میں

انجینئر معراج احمد خاں

میں نے مہر کے سلسلے میں جو معروضات پیش کیں اس پر مرحوم و مغفور قاضی مجاہد الاسلام صاحب (امارت شرعیہ، بہار واڑیسہ/ ملی کونسل) یاد آئے، انھوں نے مہر کے سلسلہ میں ایک تجویز رکھی تھی کہ: نکاح کا مہر سونے اور چاندی میں طے کیا جائے۔

عائلی حقوق کے معاملے میں مردوں اور عورتوں نے اگر دو مخالف فریقوں کی شکل اختیار کر لی تو یہ صورت حال ملک اور معاشرے کے لئے انتہائی تباہ کن ثابت ہوگی۔ معاشرے کو ان حقوق سے بہرہ ور کر کے حالات کو معمول پر لایا جائے ورنہ مختلف صنفوں کے حقوق کی الگ الگ پاسداری دونوں صنفوں کے مابین صف آرائی کا ماحول پیدا کر دے گی۔ اس معاملے میں معاشرے کے خوشحال طبقے کو پہل کرنا ہوگی اور نکاح جیسے شرعی عمل کی انتہائی سادگی کے ساتھ مساجد میں تکمیل کے ذریعہ ان خرابیوں پر قابو پانا ہوگا جو آگے چل کر پیدا ہوتی ہیں۔ ہم ایسا کر سکے تو اس ملک کو اور اپنے معاشرے کو بہت کچھ دے سکیں گے۔ شادیوں کے موقع پر بڑے پیمانے پر دعوت عام اور اسراف بیجا کی مذمت کیجانی چاہیے۔ جس سماجی آزادی سے دوسروں کو کوئی نقصان پہونچے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

نکاح میں مہر کو سونے اور چاندی میں طے کیا جائے، تاکہ طلاق ناگزیر ہونے پر مطلقہ کو مہر کی شکل میں ایسی رقم ہاتھ آئے جس کی قدر گھٹ نہ چکی ہو۔

اس تجویز پر ایک سیمینار میں بحث ہوئی جس پر شرکا دل سے قائل تو ہوئے لیکن وہی پرانی ریت کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو تو جیسا کرتے دیکھا ہے، وہی کریں گے، بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ تجویز اچھی تھی، اب بھی غور کیا جا سکتا ہے، اگر بات پسند آئے تو قاضی مجاہد الاسلام صاحب کے لئے دست بہ دعا ہو ویں۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی کی نئی کتاب

مسائل ومباحث

پروفیسر شروانی کی نئی کتاب مسائل ومباحث حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۱۹۴۹ء سے ۲۰۱۷ء تک کے سیاسی مسائل ومباحث پر تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں مسلمانانِ ہند، ہندوستان اور بیرونِ ہند سے متعلق امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان میں تقریباً ۷۰ برس کے حالات وکوائف آجاتے ہیں۔

کتاب کی ضخامت ۳۴۷ صفحات ہے اور قیمت =/۵۰۰ روپے ہے۔

متعدد مشاہیر کی وفیات بھی شامل ہیں۔

ناشر

براؤن بکس پبلی کیشنز، نئی دہلی 110025

+91-9818897975,0571-2700088

ملنے کے پتے:

(۱) براؤن بکس، علی گڑھ

(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ

Monthly FIKR-E-NAU Aligarh

Jun 2019